تاریخ

فہرست مضامین

تاریخ	892
بالادستی کا فلسفہ اور انجام	893
دینی مدارس۔ ماضی، حال، مستقبل	896
فلسفۂ تاریخ	901
فتنہ......۱	904
فتنہ......۲	908
اسلامی تاریخ کا المناک باب	912
جب برطانیہ سپر پاور تھا!	916
مغرب اور اسلامی دنیا کی تاریخ	920
مینارِ مساجد کی مختصر تاریخ	924
مستند تاریخ کی اہمیت	928
پاکستان کا قیام ناگزیر تھا	932
تاریخ کی گواہی	936

☆......☆......☆

بالا دستی کا فلسفہ اور انجام

مشہور ماہر سماجیات و عمرانیات ابن خلدون نے فلسفۂ تاریخ اقوام کے بارے میں اپنے شہرۂ آفاق مقدمہ "ابن خلدون" میں لکھا ہے کہ جو اقوام محنت و مشقت اور ہر قسم کی ریاضت سے اور زمانے کے نشیب و فراز کی تپتی بھٹی میں تپ کر آگے بڑھے تو تب جا کر کندن بن جاتی ہیں۔

قوم کی ترقی کیلئے جہاندیدہ، مستقل مزاج اور گرم و سرد چشیدہ رہنماؤں اور افراد کی ضرورت ہوتی ہے، تب کہیں جا کر ایسی قوم سپر قوم بنتی ہے۔ نبی پاک ﷺ کے ساتھی (صحابہ کرامؓ) تیرہ سال مکی زندگی میں ہزار مصائب و آلام سے گزر کر مدنی زندگی میں دس سال ہر وقت ریاست، افراد اور معاشرے کی حفاظت کیلئے سر بکف ہر وقت میدان جنگ میں کھڑے رہے تب کہیں جا کر فتح مکہ کا موقع آیا اور پھر سارا جزیرۃ العرب اسلام کی آغوش میں سمٹ کر آیا اور یوں عرب قوم ایک ایسی قوم میں تبدیل ہوئی جو دُنیا کے تین براعظموں پر پھیل کر رہی۔ تین براعظموں پر حکمرانی کے پیچھے جو فلسفہ کارفرما رہا، ابن خلدون کے الفاظ میں وہ عربوں کی وہ سخت جانی تھی کہ عرب پیغام توحید کی اشاعت کیلئے جب بحر ظلمات کو عبور کرنے کیلئے جون جولائی کے گرم صحرائی لُو میں ننگے پاؤں سفر کرتے ہوئے ببول کے کانٹوں کو پاؤں میں چھبنے کے باوجود جھک کر نکالنے کے روادار نہ تھے بلکہ پاؤں کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے منزل کی طرف آگے بڑھتے تو ایک دُنیا اُن کے زیرِ نگین تھی اور کوئی اُن کے مقابل آنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ لیکن پھر ابن خلدون کے مطابق جب کسی قوم کو تازہ خون میسر ہونا بند ہو جائے تب وہ قوم جو بام عروج پر پہنچی ہو بالکل عمودی طور پر ڈھلوان سے لڑھکنے کی بجائے گرنا شروع کر دیتی ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ وہ اوج ثُریا سے گر کر زمین پر آلگتی ہے، یہی فلسفہ تاریخ اقوام ہے۔ ملتِ اسلامیہ انہی مراحل سے گزر کر موجودہ صورتحال تک پہنچی ہے۔

سپین سے مسلمانوں کے انخلاء اور خلافت عثمانیہ کے بکھر جانے کے بعد طاقت کا پلڑا یورپ رمغرب بالخصوص برطانیہ کی طرف منتقل ہوا۔ برطانیہ عظیم رہنماوں کی قیادت، دور بینی اور عوام کی سخت جانی و برداشت کا اندازہ اِس سے لگایا جا سکتا ہے کہ برطانیہ کے سول سرونٹس ہزاروں میل فاصلہ سات سمندروں کو پار کر کے طے کرتے تھے اور جنوبی ایشاء میں اپنے وطن اور آل اولاد سے دور رہ کر بھی اپنے وطن کی خدمت کیلئے تن من دھن

کی بازی لگانے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

دوسری طرف برطانیہ کے اندر سکول، کالج اور جامعات اور عدالتیں اور دیگر ادارے اِس معیار پر پہنچ چکے تھے کہ جنگ عظیم میں جرمن جنگی جہازوں کے ہاتھوں سخت ترین بربادی سے دوچار ہوکر بھی لوگ مطمئن رہے کہ برطانوی عدالتیں جنگ کی حالت میں بھی خلقِ خدا کو انصاف بانٹ رہے ہیں، برطانیہ کا انصاف اِس قدر شہرت یافتہ ہوگیا کہ ہندوستان کے پرانے باشندے آزادی کے بعد ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کے بعد بھی برطانیہ کے عدل وانصاف کی داد دیتے ہوئے یاد کرتے رہے۔

برطانیہ اتنی سخت جدوجہد اور علمی تپسیا کی بدولت یہ مقام حاصل کر چکا تھا کہ یہ بات زبان زدِ خلائق ہوئی کہ برطانیہ کی سلطنت پر سورج غروب ہی نہیں ہوتا کیونکہ جاپان سے لیکر ہندوستان اور ہندوستان سے لیکر برطانیہ ہی برطانیہ تھا لیکن پھر دوسری جنگ عظیم کے بعد جب برطانیہ نے ظاہراً جنگ جیت لیا تھا اور جرمنی کو ایسی شکست ہوئی کہ جرمنی دوملکوں میں بٹ کر رہ گیا، آہستہ آہستہ سمٹتے ہوئے جزیرۂ برطانیہ کی صورت میں نمودار ہوا اور برطانوی استعمار کے نیچے زندگی گزارنے والے ممالک آزاد ملکوں کی صورت اختیار کر گئے۔ لیکن برطانیہ کو جس قوت کی بناء پر ظاہری فتح حاصل ہوئی وہ امریکہ کا جاپان پر ایٹم بم کا استعمال تھا ورنہ جاپان تو مشرق بعید اور برما کو روندتے ہوئے ہندوستان کی سرحدوں پر دستک دینے لگا تھا۔ اِس کے ساتھ ہی برطانیہ کے ننھیال کہ مسٹر چرچل کی والدہ امریکی تھی، دُنیا کی سٹیج پر نمودار ہونا شروع ہوئے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۹۰ء گو بعد میں امریکہ کے سوویٹ یونین بھی سپر پاور کے طور پر متوازی انداز میں بیدار ہوا لیکن بہت جلد سوویٹ یونین کی افغانستان پر فوج کشی کی غلطی نے امریکہ کو دُنیا کا تنہا سپر پاور بنالیا۔

۱۹۹۰ء کے بعد جب روسی افواج بہت ہزیمت اُٹھا کر افغانستان سے نکل گئیں تو اِس دہائی میں امریکہ کی بے مثال عسکری قوت استعمال کرنے کی پوری دُنیا کو مٹھی میں لینے کی کوشش کی اور اِس کوشش میں امریکہ نے وہ سب کچھ داؤ پر لگانے کی بھی کوشش کی جو وہ ۱۹۴۵ء سے ۲۰۰۰ء تک کما کر محفوظ کرتا رہا تھا اور جس کی بناء پر وہ سپر سپر پاور تسلیم کیا جاتا رہا۔

امریکہ نے دُنیا اور بالخصوص اسلامی دُنیا پر اپنی برتری (Supermacy) قائم کرنے کیلئے دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر افغانستان اور عراق پر اُسی طرح فوجیں چڑھائیں جس طرح سوویٹ یونین

نے چڑھائی تھیں لیکن اِن دونوں مسلمان ملکوں پر فوج کشی امریکہ کے دشمنوں کے تعداد میں اضافے کا زبردست سبب بنیں۔

امریکہ نے اِن دو کمزور مسلمان ملکوں پر جنگ مسلط کر کے دُنیا بھر کے ممالک کو دھمکانے کی انداز میں پوچھا، تم دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ہمارے ساتھ ہو یا پھر ہمارے خلاف؟ یعنی کسی کو غیر جانبدار رہنے کے حق سے بھی محروم کر دیا۔ اِس کا نتیجہ آج یہ سامنے آیا ہے کہ امریکہ نے صدام حسین کی حکومت پر وسیع تباہی کے ہتھیار بنانے کا جوالزام عائد کیا تھا وہ امریکی تحقیقاتی اداروں کے اعلان کے مطابق صحیح نہیں تھا۔ اِسی طرح صدام حکومت کیمیائی ہتھیاروں کے الزام میں کوئی صداقت ثابت نہیں ہوئی۔

اسی طرح افغانستان پر جن خدشات (دہشت گردی) کو ختم کرنے کیلئے حملہ کر کے ہزاروں لاکھوں بے گناہ انسانوں کا خون بہایا گیا، دہشت گردی میں اور بھی اضافہ ہوا اور دُنیا پہلے سے زیادہ غیر محفوظ ہو گئی۔

عراق اور افغانستان کے بارے میں نہ اقوام متحدہ کے سلامتی کونسل کی سنی گئی اور نہ یورپ بھر میں لاکھوں افراد کے مظاہروں نے بش حکومت پر کوئی اثر کیا اِس ساری صورت حال سے ایک ایسا امریکہ دُنیا کے سامنے آیا جو کسی کی بات نہیں مانتا اور اپنے آپ کو سب سے زیادہ بلندی پر دیکھنا چاہتا ہے خواہ اِس کیلئے اُس کو کچھ بھی کرنا پڑے۔ یہ نہ صرف خود امریکی اصولوں کے منافی ہے بلکہ ایسا امریکہ پوری دُنیا کیلئے خطرناک ہے۔ آج کا امریکہ معیشت اور ٹیکنالوجی کے لحاظ سے بے شک طاقت کی علامت ہے مگر طاقت جب اِس حد پر پہنچ جاتی ہے کہ کوئی چیز دکھائی ہی نہ دے تو یورپی یونین کا قیام، چین کا اپنی معیشت کو روز افزوں ترقی دینا اور چین اور روس کے درمیان اتحاد وقت کی ناگزیر ضرورت بن جانا فطری امر ہوتا ہے۔ اِن حالات میں مجبوراً مسلمانوں کو بھی اپنی بقاء کیلئے متحد ہونا پڑے گا ورنہ یاد رکھیں کہ امریکہ کا سپر پاور کے تخت سے اُترنا نوشتہ دیوار بن چکا ہے۔ لہٰذا یورپی یونین، چین روس اتحاد، کی موجودگی میں امریکہ کے بعد مسلمان کسی اور سپر پاور کے رحم وکرم پر ہوں گے۔ لہٰذا مسلمان حکمرانوں کو ہوش کے ناخن لے کر مسلمانوں کے اتحاد کیلئے مظبوط بنیادوں پر کام کرنا ہوگا ورنہ ہماری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔

☆......☆......☆

دینی مدارس۔ ماضی، حال، مستقبل

۹/۱۱ کے بعد پاکستان کے دینی مدارس کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا۔ امریکہ اور مغرب نے بہت سارے افراد، این جی اوز، حکومتی اداروں اور تھنک ٹینکس وغیرہ کے ذریعے ہمارے دینی مدارس کے حوالے سے اعداد و شمار، نصابات، تاریخی پس منظر، اغراض و مقاصد اور نہ جانے کیا کیا جمع اور کمپیوٹرائز کیا۔ دینی مدارس کے بارے میں جمع کئے گئے کوائف اور معلومات کے ذریعے مدارس کے مؤسسین، معلمین، مؤیدین اور مخالفین نے بہت عجیب و غریب قسم کے اقدامات تجویز کئے یا اُٹھائے۔ ۹/۱۱ کے بعد پاکستان کے مدارس امریکہ اور مغرب کی دلچسپی اور دُشمنی کا ہدف اِس لئے ٹھہرے کہ افغانستان پر اُس وقت جن لوگوں کی حکومت تھی وہ طالبان کے نام سے معروف ہوئے تھے اور اُن میں سے زیادہ تر کا تعلق پاکستان کے دینی مدارس سے بتایا جاتا تھا۔ یہاں پر شاید اِس بات کا ذکر بھی بے جا نہ ہوگا کہ اُس زمانے میں پاکستان کے بہت سارے لوگ اور حکومت طالبان کو اپنا گردانتے تھے اور اُن کے ساتھ تعلق یا اُن کو اپنا شاگرد اور طالب وغیرہ کہلانے پر ایک قسم کے افتخار کا اظہار کرتے تھے، پھر جب افغانستان کے طالبان کو ۹/۱۱ کا کسی حجت دلیل اور عدالتی کاروائی کے بغیر سزاوار ٹھہرایا گیا اور افغانستان پر امریکہ نے کارپٹ بمباری اور تورا بورا کر کے قبضہ کیا تو طالبان کے معتوب ٹھہرے کے ساتھ ہمارے دینی مدارس کو بھی سزا کے مستحق ٹھہرانے کی کوششیں شروع ہوئیں جو آج تک جاری ہیں۔ اب جب کہ پُلوں کے نیچے سے بہت سارا پانی گزر چکا ہے اور طالبان کے نام پر افغانستان، پاکستان اور دیگر اسلامی دُنیا کو بہت سارے ناقابل تلافی نقصانات کا سامنا کرنا پڑا، ضرورت اِس بات کی ہے کہ حکومتی سطح پر پاکستان بھر کے محققین اور مفتشین کا ایک ایسا تھنک ٹینک بنایا جائے جو پاکستان کے دینی مدارس کے حوالے سے عرق ریزی کے ساتھ تحقیقی انداز میں کام کر کے ایک ایسی جامع اور بسیط رپورٹ تیار کر کے حکومت کو پیش کرے جس کی روشنی میں ماضی اور حال کا تجزیہ اِس انداز میں کیا جائے کہ ہمارے مدارس کی خوبیاں اور خامیاں دوٹوک اور واضح انداز میں لوگوں کے سامنے آجائیں۔

اِس بات میں دوسری رائے نہیں ہوسکتی کہ پاکستان کے زیادہ تر دینی مدارس پر "مدرسہ دیوبند" کے اثرات لازمی طور پر مرتب ہوتے ہیں۔ اِس بات میں بھی شک نہیں کہ "مدرسہ دیوبند" مسلمانانِ ھند کے

شاندار ماضی کی علامت کے طور پر آج بھی جلیل القدر خدمات سرانجام دے رہا ہے لیکن مدارس پر کام کرنے اور اِس حوالے سے جاننے والے لوگ شاید اِس بات سے انکار نہیں کرینگے کہ مدرسہ دیوبند کے قیام کے پس منظر میں جو قوت سب سے زیادہ کام کر رہی تھی وہ مسلمانانِ ھند کے عقائد اور دینِ اسلام کو استعماری ھتکنڈوں اور حیلوں اور مکاریوں سے محفوظ کرنا تھا۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے جس زمانے میں اِس تاریخی مدرسے کی بنیادیں رکھی تھیں اُس وقت مسلمانانِ کو برطانوی استعمار کے ہاتھوں لگے زخم ابھی بہت تازہ تھے لہٰذا مولانا مرحوم نے مدرسۂ دیوبند کو استعمار کے خلاف ایک مورچہ قرار دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مدرسۂ دوبند کے اکابرین نے اپنا یہ کردار ایسا نبھایا کہ دین کے تحفظ اور ھندوستان کی آزادی کیلئے اِس مدرسہ کے اساتذہ کرام اور طلباء کی بے مثال قربانیاں آج بھی تاریخ میں محفوظ اور مسلمانانِ ھند کیلئے سرمایۂ افتخار ہیں لیکن اِس کے ساتھ جب دارلعلوم علی گڑھ کی صورت میں بالکل ایک متوازی، (متوازی اس لحاظ سے کہ سر سید احمد خان کا دعویٰ بھی مسلمانانِ ھند کی خیر خواہی کا تھا) نظام تعلیم سامنے آیا تو شاید ھند کی تاریخ میں پہلی دفعہ دینی مدارس کے کردار، نصاب اور بعض دیگر امور پر تنقید ہونے لگی۔

تحریک پاکستان کے وقت چونکہ علمائے دیوبند کا مؤقف متحدہ ھندوستان کا تھا اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اُن کا یہ مؤقف بھی مسلمانانِ ھند کی بھلائی و خیر خواہی کے پیش نظر تھا، لیکن اُس وقت شاید جذبات کی رو میں بعض لوگوں نے اِس کی تعبیر صحیح طور پر نہیں کی اِس بناء پر قیام پاکستان کے بعد بھی اِس کی بازگشت وقتاً فوقتاً سنائی دیتی رہی۔

قیام پاکستان کے بعد علماء کرام اور طلبہ جو دیوبند سے فارغ التحصیل تھے اُنہوں نے پاکستان کے مختلف علاقوں میں اُسی طرز پر مدارس قائم کئے اور نصابات بھی زیادہ تر کم و بیش اُسی مواد پر ترتیب دئے گئے۔ قیام پاکستان کے وقت دو بڑی مذہبی و سیاسی جماعتیں، جمعیت علمائے اسلام اور جماعت اسلامی موجود تھیں۔ بعد کے ادوار میں پاکستان کی سیاست میں حصہّ لینے لگیں تو دیگر مذہبی گروہوں کو مسجد اور منبر و محراب کی طاقت کا اندازہ ہوا تو اُنہوں نے بھی اپنی اپنی سیاسی جماعتیں بنا لیں اور ہر مذہبی جماعت نے اپنے نقطۂ نظر کو پھیلانے کیلئے منبر و محراب کے علاوہ مدارس قائم کرنے پر توجہ دی۔

ہر مذہبی جماعت کے نزدیک دینی مدارس کے قیام کا مقصد دین کی اشاعت اور اپنی آئندہ نسلوں کو اِسلام

کی خدمت کیلئے تیار کرنا تھا۔ لیکن آگے جا کر ووٹ، سیاست، کرسی، وزارت اور اقتدار نے دینی مدارس کے اہداف ومقاصد کو بہت زیادہ وسیع کردیا۔

پاکستان کے دینی مدارس میں بہت ساری خامیوں کے باوجود سب سے بڑا اور مثبت نکتہ یہ رہا ہے کہ اِن کے ذریعے پاکستان کی ایک بہت بڑی غریب آبادی تک کچھ نہ کچھ علم کی روشنی پہنچتی رہی ہے۔ یہ بات بھی ہر کسی کو معلوم ہے کہ دینی مدارس میں زیادہ تر طلبہ معاشرے کے اُن طبقات سے آتے ہیں جو خطِ غربت کے نیچے یا کچھ اوپر رہتے ہیں۔ لہٰذا مدارس اور اُن کے اساتذہ کرام کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ لاکھوں بچوں اور بچیوں کو بغیر کسی فیس اور کھانے پینے کے خرچ اخراجات کے کم ازکم بنیادی تعلیم دلا کر مزید تعلیم کی راہ پر ڈال دیتے ہیں۔ اِس طرح دینی مدارس وطنِ عزیز مین اس لحاظ سے بہت بڑا کام کرتے ہیں کہ وہ ملک جہاں لاکھوں بچوں کو کسی تعلیمی ادارے میں جانا نصیب نہیں ہوتا، کم از کم لاکھوں بچے دربدر پھرنے اور غلط لوگوں کے ہاتھوں میں جانے سے محفوظ رہتے ہیں۔ دینی مدارس کے اساتذۂ کرام لائقِ تحسین ہیں کہ خود بہت کٹھن پس منظر سے گزر کر بہت صبر آزما مراحل میں قوت لا یموت کی صورت میں اپنا پیشۂ پیغمبری سرانجام دیتے ہیں۔ چونکہ مدارس کے علمائے کرام اپنے پیشے کو پیشہ نہیں بلکہ سنتِ رسول ﷺ کی حیثیت سے مشن سمجھتے ہیں لہٰذا ۹/۱۱ سے پہلے مدارس کے حوالے سے کبھی بھی دہشت گردی کا سوال سامنے نہیں آیا۔ ہاں مسلکی اور فقہی اعتبار سے مختلف مکاتب فکر کے درمیان اختلافات ضرور رہے ہیں اور بعض اوقات ملک وقوم پر اُس کے بہت مضر اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں اور بعض سیکولر فاشسٹ اس قسم کے واقعات کی بنیاد پر دینی مدارس اور اُن سے منسلک علمائے کرام کے خلاف دِل کا بھڑاس نکالنے کا موقع استعمال نہیں کرتے لیکن اِس سب کچھ کے باوجود دینی مدارس کے علماء اور طلبہ نے کبھی ملک وقوم کو کوئی نقصان نہین پہنچایا ہے بلکہ وطن عزیز میں منبر ومحراب کو آباد رکھ کر پاکستان کو سیکولر لوگوں کے ہاتھوں میں جانے سے محفوظ رکھا۔

البتہ یہاں یہ بات بہت اہم اور قابلِ ذکر ہے کہ پاکستان کے دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ افغانستان پر روس کے حملہ کے بعد بہت سارے عوامل اور عناصر اور مقاصد کے تحت بہت شدّت کے ساتھ منظرِ عام پر آئے ورنہ اس سے پہلے دینی مدارس کی اپنی ایک دُنیا تھی جس میں اُس کے اساتذہ اور طلبہ خوش وخرّم اور دُنیاوی لذائذ سے بے خبر اپنی نظریں آخرت پر مرکوز کئے اپنا فرض خموشی کے ساتھ سرانجام دے رہے تھے۔

اسلامی ممالک اور امریکہ کو اِن کی ضرورت پڑی اور مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کو مدارس سے نکال کر وہاں لے گئے جہاں اُن کو ضرورت تھی۔ امریکہ اور حکومتوں کے اپنے مقاصد اور اہداف تھے لیکن اُس وقت بھی مدارس سے وابستہ افراد ایک مخلصانہ کردار اور دینی مقصد کی خاطر اس عالمی کھیل میں امریکہ کے شاطرانہ اہداف نہ جانتے ہوئے شریک ہوئے اور اِس میں شک نہیں کہ اُنہوں نے ایک لازاوال کردار ادا کیا لیکن اِس مقام پر ہمارے دینی مدارس کے ساتھ بہت سارے لوگوں کا تعلق قائم ہو گیا جس کے اثرات دینی مدارس پر قائم ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ افغانستان کے جہاد میں ہمارے دینی مدارس کے لوگوں کو پہلی دفعہ دنیاوی آسائشوں اور مالی مراعات کا سامنا بھی ہوا۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ پیسہ دیتے ہیں اُن کے کچھ اپنے اغراض بھی ہوتے ہیں۔ یہی وہ لمحہ تھا جب ہمارے سیدھے سادے دینی مدارس میں سے بعض مختلف النوع مقاصد کیلئے استعمال ہوئے ہونگے لیکن مدارس کے مخالفین نے اِس کا استحصال کرتے ہوئے مدارس کے خلاف بیرونی آشیر وار سے ایسی مہم چلائی جس میں مدارس کا تعلق دہشت گردی کے ساتھ جوڑا جانے لگا۔

میں اب بھی اِس بات پر قائم ہوں کہ وہ مدارس جہاں قال اللہ وقال الرسول ﷺ کی مُشک بوصدا صبح و شام بلند ہوتی ہے کسی طور پر بھی دہشت گردی میں ملوث نہیں ہو سکتے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ مدارس سے فارغ التحصیل بعض لوگ مسلک، عقائد اور بعض دیگر رجحانات کی وجہ سے دین کے نام پر بعض ایسے عناصر کے ہاتھ لگے ہوں جن کے مقاصد ہمارے اِن طلبہ پر واضح نہ ہوں۔ لہٰذا حکومت وقت کا فرض ہے کہ اب جبکہ حالات بہت نازک صورت اختیار کر چکے ہیں، دینی مدارس کو اپنے ملک کے دیگر تعلیمی اداروں کی طرح اپنے ادارے سمجھ کر قومی دھارے میں شامل کرنے کے اقدامات کرے۔ اِس کے لئے بہت گہری منصوبہ بندی کے ساتھ وزارتِ تعلیم کے تحت سالانہ بجٹ میں اساتذہ کرام کی تنخواہیں، طلبہ کے کھانے پینے اور لباس و کتب کے اخراجات کیلئے فنڈز مختص کریں۔ پاکستان بھر کے دینی مدارس کے علماء و اساتذہ کرام کو اعتماد میں لیکر اُن سے ایک ایسا نصاب بنوایا جائے جو ایک طرف مسلکی اختلافات کو کم کرے اور دوسری طرف عصری تقاضوں کو پورا کرے۔

مجھے یقین کامل ہے کہ پاکستان کے دیگر سرکاری تعلیمی اداروں کے مقابلے میں ہمارے یہ ادارے [مدارس] ملک و قوم کیلئے زیادہ مفید ثابت ہونگے اگر اِن کو وہی توجہ دی گئی جو دیگر سرکاری اداروں کو دی جاتی ہے۔ اِس کے علاوہ حکومت سارے مدارس کا سالانہ آڈٹ، آمدن و خرچ اور آمدن کے وسائل و ذرائع کی جانچ

پڑتال کرے۔ ہر مدرسہ اپنے وسائل آمدنی اور اخراجات کو مصدقہ انداز میں شفاف طریقے سے حکومتی اداروں کے ساتھ شیئر کرے۔ اس طرح ملک وقوم اور دینی مدارس دونوں کو بھرپور فائدہ ہوگا اور مخالفین و معاندین کو ہمارے دینی مدارس جو دین اسلام کی حفاظت کے قلعے ہیں، پر دہشت گردی کا الزام لگانے کے مواقع بھی مُیسر نہ ہونگے۔

کسی اور نشست میں اِس حوالے سے مزید کچھ معروضات پیش کی جائیگی کہ ایک کالم میں اِس تفصیل کی گنجائش نہیں۔

☆......☆......☆

فلسفۂ تاریخ

عالمِ اسلام کے مشہور مفکر، مفسر اور مورخ ابن اثیر نے بغداد پر ہلاکو خان کی تباہی کے نزول کے بعد دو تین سال تک صرف اس نیت کے ساتھ بغداد کی تباہی پر کچھ نہ لکھا کہ شاید کوئی اور ان خونچکاں واقعات کی تاریخ لکھ لے اور میری انگلیاں فگار ہونے سے بچ کر رہ جائیں۔ لیکن جب اتنی مدّت میں عالمِ اسلام میں کہیں سے بھی تاریخ بغداد کے ان داغ داغ اور زخم زخم حالات پر کوئی تصنیف وغیرہ سامنے نہ آئی تو چاروناچار خود لکھنے بیٹھ گئے اور الکامل فی التاریخ جیسی نادر روزگار کتاب میں اُن سارے واقعات کو اِس طرح سمویا کہ ہر لفظ میں اُس عالمِ دین کے دِل کا درد صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اقوام کی تاریخ میں وہ واقعات اور لمحات امر ہو کر تاریخ کا حصّہ بن جاتے ہیں جو بُھلائے نہیں بھولتے۔ دُنیا کی تاریخ میں بہت سارے واقعات ایسے ہیں جو اقوام کیلئے دائمی طور پر سبق آموز ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ لوگ اور اقوام اپنی تاریخ اور تاریخ کے اہم واقعات کو ہمیشہ یاد رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور خاص مواقع پر اُن کی یاد مناتے ہیں۔ یاد منانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہماری تاریخ میں دوبارہ کہیں ایسے واقعات وقوع پذیر نہ ہو جائیں جس نے ہمیں ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہو۔

فرانس میں سارے اتحادی ممالک اُس ساحل پر جمع ہو کر آج بھی ہر سال اُس دن کی یاد مناتے ہیں جب ہٹلر کی افواج نے فرانس پر قبضہ کرنے کیلئے حملہ کیا تھا۔ امریکہ نے ویت نام میں اپنے سڑسٹھ (٦٧) ہزار کام آئے فوجیوں کی یاد میں واشنگٹن میں ایک ایسی یادگار دیوار بنوائی گئی جو فضا سے زمین میں ایک گھاؤ کی مانند نظر آتا ہے، امریکہ کو اُس تاریخی واقعے اور لمحے سے یہ سبق سیکھنا چاہیے تھا کہ دوسری اقوام کو محکوم اور اُن کے ملکوں اور وسائل کا استحصال کرنے سے باز آ جائیں لیکن کیا کیا جائے کہ انسان کی فطرت یہی ہے کہ وہ اپنے دنیوی فوائد کو قریب اور عاجل سمجھ کر اُخروی نتائج کو بھول جاتا ہے اور بار بار وہی غلطیاں دُہراتا ہے جس کی بناء پر وہ واقعات وجود میں آتے ہیں جو انسانیت کے نام پر سیاہ داغ بن کر رہ جاتے ہیں۔

اِس سلسلے میں تاریخی واقعات کی ورق گردانی کرتے ہوئے انسان یہ دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے کہ افراد اور اقوام بار بار ایک ہی سوراخ سے ڈسے جاتے ہیں ورنہ سوویت یونین جیسی طاقت کیوں انتشار سے دوچار

ہوئی۔ دُنیا اور بالخصوص امریکہ نے سوویت یونین کا زوال اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ اِس میں اہم کردار ادا کیا لیکن اس کے بعد خود اُسی راستے پر گامزن ہوا جس پر چل کر سوویت یونین کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے تھے۔

اگر کوئی تاریخی واقعات کو بھول جائے اور اُس سے سبق نہ سیکھے تو اُس کی مثال ایسے شخص کی ہوتی ہے جو اپنا حافظہ کھو بیٹھے کیونکہ تاریخ کی حیثیت قوم کے حافظے جیسی ہوتی ہے۔ اسلامی تاریخ میں واقعۂ بغداد کے علاوہ سقوطِ غرناطہ، سقوطِ خلافتِ عثمانی اور سقوطِ ڈھاکہ، سقوطِ عراق اور افغانستان ایسے ناقابلِ فراموش اور سبق آموز واقعات ہیں جن سے ہم مسلمانوں کو بہت کچھ سیکھنا چاہیے تھا اور ہمیں آج کے طاری حالات میں پھنسنا نہیں چاہیے تھا لیکن اب جبکہ یہ حالات آ ہی گئے ہیں تو ہم سب کا بحیثیت قوم یہ کردار ہونا چاہیے کہ کہ اب بھی اپنی تاریخ سے سبق سیکھیں۔

حضرت عمر فاروقؓ سے ایک یہودی نے کہا کہ آپ لوگوں کی کتاب قرآن کریم میں ایک آیت ہے، اگر وہ ہم (یہود) پر نازل ہوتی تو ہم اُس دن کو بطور عید مناتے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے جواب دیا "مجھے وہ دن وہ مقام اور وہ لمحہ بھی یاد ہے جب وہ آیت مبارکہ جناب رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی تھی اور ہم اُس دن کو ایک عید نہیں بلکہ دو عیدیں مناتے ہیں"۔ وہ آیت کریمہ یہ تھی "(ترجمہ) آج کے دن ہم نے تمہارے لئے تمھارے دین کو مکمل کرلیا اور تم پر اپنی نعمتیں تمام کردیں اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین (ضابطہ حیات) پسند کرلیا۔" یہ آیت کریمہ جناب رسول اللہ ﷺ پر یوم عرفہ کے دن میدان عرفات میں نازل ہوئی تھی اور آج بھی اُن ہی ایاّم میں ایک طرف عیدالاضحیٰ منائی جاتی ہے اور دوسری طرف قیام عرفہ کرکے حج کا اہم رکن ادا کیا جاتا ہے۔

مسلمانانِ عالم اپنی تاریخ کا یہ اہم واقعہ اگر یاد رکھیں تو ہم سب پر ہر وقت واضح ہوگا کہ اسلام اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے اس کے ذریعے مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی تکمیل ہوتی ہے اور چونکہ یہ کامل دین ہے لہٰذا اِس میں ہر شعبہءِ زندگی سے متعلق معاملات و امور کے متعلق تیر بہدف رہنمائی اور ہدایت موجود ہے۔

کیا آج وطنِ عزیز پاکستان میں دہشتگردگی، امنِ عامہ اور ہوس و حرص اور قتل و غارت کے جو واقعات ہو رہے ہیں، ہم اپنی تاریخ کے اُن خونچکان و خون ریز واقعات سے سبق سیکھتے ہوئے اِس کامل دین سے یہ نہیں سیکھ سکتے کہ ہم سب مسلمان بھائی ہیں۔

مسلمان آپس میں لڑا نہیں کرتے بلکہ مسلمان تو ایک جسم کی مانند ہوتے ہیں اور آپس میں تعاون اور بھائی چارے کے حوالے سے ایک عمارت کی اینٹوں کی طرح ایک دوسرے کو مضبوط کئے ہوتے ہیں۔

پاکستان حاصل کرنے والوں بزرگوں اور اسلاف نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اہلِ پاکستان اپنے اعمال کے ہاتھوں ایسی صورت حال سے دوچار ہونگے، پاکستان تو اِس غرض کیلئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں ایک اسلامی فلاحی مملکت قائم ہوگی جہاں اس کے باشندوں کو بنیادی انسانی حقوق کی بطریقہ احسن فراہمی ہوگی اور پوری دُنیا کیلئے پاکستان ایک اسلامی ملک کی حیثیت بطور ایک بہترین مثال سبق ہوگا۔

لیکن ہم جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں نے جہاں ھندوستان پر آٹھ سو سال تک ایک شاندار حکومت قائم کر کے ایک دُنیا کو اپنی طرف متوجہ کرلیا وہاں ایک ایسا معاشرہ قائم نہ کر سکے جسے فلاحی کہا جا سکے۔

آج یورپ کے ممالک میں اُن کے اپنے معاشرتی اقدار کے پیشِ نظر وہاں انسانیت کی فلاح کیلئے جو کچھ ہوا ہے یا ہو رہا ہے، کاش ہمارے ہاں اس کا عُشرِ عشیر بھی ہو جاتا تو آج یہ صورت حال نہ ہوتی۔ ہم نے مسلمان اور مکمل اور پسندیدہ دین کے ماننے والے ہوکر بھی اپنے معاملات، اخلاقیات اور معاشرتی تعلقات اور اقدار کے ذریعے اسلام کا ایک ایسا چہرہ دُنیا کے سامنے پیش کیا جس کی طرف بہ رضا و رغبت بہت کم لوگ ہی مائل ہو سکتے ہیں البتہ غیر اسلامی دُنیا سے جتنے لوگ بھی اسلام کے دائرے میں داخل ہوئے ہیں وہ اِسی دین متین کی روشن اور کامل و اٹل تعلیمات ہی سے متاثر ہوکر داخل ہوتے ہیں۔ غیر اسلامی دُنیا بالخصوص مغربی دُنیا سے اسلامی دُنیا میں قدم رکھنے والوں کی تعداد انگنت ہوتی اگر مسلمان دُنیا میں ایسے معاشرے موجود ہوتے جو اِس دین کامل کے آئینہ دار ہوتے۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے لینن کو اسلام کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن جب لینن نے اِس کی کوئی عملی صورت و نمونہ کا مطالبہ کیا تو عبیداللہ سندھیؒ اُس وقت کے مسلمانوں کے موجودہ معاشروں میں سے کوئی مثال پیش کرنے سے قاصر رہے۔

کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ ہم پاکستان کو اسلامی رجعت پسندوں اور لبرل فاشسٹوں کے قبضے سے چھڑا کر صحیح معنوں میں ایک ایسی اسلامی جمہوری فلاحی مملکت بنانے کی کوشش کریں جس میں ایک طرف قرآن وسنت کی مبارک تعلیمات کے زمزمے ہوں اور دوسری طرف سائنس وٹیکنالوجی کی عمیق تعلیمات کے اثر کے تحت زندگی آسان پرآسائش اور آرام دہ ہو۔ اِس حسین امتزاج کے نتیجے میں احترام آدمیت وانسانیت کے ساتھ ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے جس کو دیکھ کر لوگ اسلام کی برکات کے قائل ہوکر اِس کی ٹھنڈی چھاؤں میں قافلۂ زندگی کو پڑاؤ فراہم کرسکے۔..................... اے کاش!

فتنہ

اندلس (ہسپانیہ-Spain) میں اسلامی سلطنت کے قیام سے پہلی دفعہ مغرب با قاعدہ طور پر اسلام اور اسلام کے تہذیبی کارناموں سے آگاہ ہوا۔لیکن اگر ہم اس بات کا تعین کرنا چاہیں کہ وہ پہلا بد بخت، شیطان فطرت اور منحوس شخص کون تھا جس نے پیغمبر اسلام نبی ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخی کا ارتکاب کیا تو مؤرخین اتفاق سے جان آف دمشق (Johan of Damascus) یا یوحنا دمشقی کا نام لیتے ہیں۔

جان آف دمشق وہ پہلا مسیحی مشنری تھا جس نے نبی ﷺ کی پاک ومقدس شخصیت پر الزامات واتہامات کا تومار کھڑا کر دیا جو بعد میں مغربی سکالرز کی تحقیق وریسرچ کا دلچسپ موضوع بن گئے۔اس نے اپنی کتاب "Pe Heave Ribas" میں آپؐ کی نبوت سے انکار کر کے آپؐ کی مقدس تعلیمات کو توہمات کا جامہ پہنانے کی کوشش کی۔اسلام کو وقتی قرار دیا اور خانۂ کعبہ کو صنم خانہ قرار دیا۔اس کے علاوہ جان نے قرآن کریم میں تعدد ازواج کی اجازت، طلاق اور اس قسم کے دیگر مسائل کو نمک مرچ لگا کر اچھالا۔حضرت زینب رضی اللہ عنہا بنت جحش ام المؤمنین کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے عقد کے واقعہ کو ایک ایسا افسانہ بنا دیا جو یورپ میں اسلام پر تحقیقات کے لئے کلاسیکی موضوعات بن گئے اور آج تک مستشرقین کے پسندیدہ عنوانات ہیں۔

جان آف دمشق کا فراہم کردہ یہی مواد مستقبل کے استشراقی فکر کی بنیاد ٹھہری اور اس پر آج کے استشراق (Orientalism)، استعمار، صلیبی فکر (Crusade)، ملٹی نیشنل کمپنیاں، این جی اوز، اور بالکل جدید انداز میں تھنک ٹینک کی لمبی چوڑی عمارت تعمیر کی گئی اور اب یہ باقاعدہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئی ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مغرب کی علمی سرگرمیوں کے دوسرے دور کا آغاز صلیبی جنگوں اور اس کے بعد کے زمانے سے ہوتا ہے۔اس دور میں یہ تحریک ایک ولولۂ تازہ کے ساتھ آگے بڑھی کیونکہ اس دور میں مغرب کے سامنے ان کے اہداف کے مقاصد بڑے واضح اور متعین تھے۔ایک طرف وہ مسلمانوں کے غیر مذہبی لٹریچر کے ساتھ فیاض دلی کا مظاہرہ کر رہے تھے جس کا اعتراف مولانا شبلیؒ جیسے عالم نے بھی کیا ہے کہ ''یورپ کی فیاض دلی رشک کے قابل ہے کہ ایک طرف تو مذہبی اختلافات کی بناء پر مسلمانوں کے خون کا پیاسا

تھا، لیکن دوسری طرف بے تکلف مسلمانوں کے خوانِ کرم سے زلہ ربائی شروع کر دی"۔

صلیبی جنگوں کے بعد مغرب کے طرز فکر اور انداز تحقیق میں تبدیلیاں رونما ہو گئیں۔ اب اسلام کی تعلیمات، نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور اسلامی تاریخ اور تہذیب و تمدن کا کوئی پہلو ایسا نہ رہا جس پر اس وقت کے مستشرقین نے طنز و تشنیع اور تعصب کے تیر نہ چلائے ہوں۔ اس زمانہ میں یورپ نے اسلام اور مسلمانوں کو وحشی اور غیر مہذب ثابت کرنے کے لئے قسم قسم کے بے بنیاد الزامات تراشے، جن میں سے اپنے زمانے کا ایک بڑا الزام یہ تھا کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے زمانے میں مصر کو فتح کرنے کے بعد اس کے اسکندریہ کے تاریخی کتب خانے کو جلانے کا حکم دیا تھا۔ مستشرقین نے اس الزام کو اس قدر مشہور کر دیا کہ غیر تو غیر اپنوں کو بھی اس واقعہ کی صداقت پر یقین آنے لگا تھا۔ اس زمانے میں یورپ نے اپنی عوام کے جذبات کو اشتعال میں لانے کے لئے مسلمانوں کے متعلق اپنے گمراہ کن خیالات کو قومی گیتوں میں ڈالا جو جنگی معرکوں میں رجز کے طور پر گائے جانے لگے۔ اس دور میں یورپ کے طرز فکر کا اندازہ مشہور شاعر دانتے (1265-1321) کی لکھی ہوئی مشہور نظم (The Divine Comedy) سے لگایا جا سکتا ہے۔ دانتے نے یہ نظم اسلام کے گہرے مطالعے کے بعد لکھی تھی لیکن یورپ میں اس دور کے افکار کے تحت اپنے زمانے کے مستشرقین سے بھی کئی ہاتھ آگے بڑھے۔ اس نے اس نظم میں (نقل کفر، کفر نہ باشد) نبی علیہ السلام کو مبتلائے عذاب دکھانے کی کوشش کی ہے اور دلیل یہ دی کہ آپؐ نے (نعوذ باللہ) عیسائیت میں انتشار و پھوٹ ڈالی ہے۔ دانتے پر صلیبی جنگوں میں عیسائیت کی شکست کا اتنا اثر تھا کہ اس نے اپنی اس نظم میں یورپ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا اور غصے میں سلطان صلاح الدین ایوبی کو بھی مبتلائے عذاب دکھایا۔ دانتے اور اس کے بعد دیگر مستشرقین نے نبی کریم ﷺ کے لئے جو نامعقول الفاظ استعمال کئے وہ مسلمانوں کے لئے ناقابل برداشت ہونے کی بناء پر نقل نہیں کئے جا سکتے۔ انہی اثرات کے تحت مغرب آگے بڑھتا رہا اور اس قسم کے خبیث اذہان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔

سترھویں صدی سے لے کر بیسوی صدی کے وسط تک مغرب کی طرف اسلام اور مسلمانوں پر دو طرف سے یلغار ہوا۔ اس زمانے میں مغرب صنعتی انقلاب کے زور پر مسلمان ممالک میں موجود ذخائر کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا اور ان پر قبضہ کرنے کے لئے منصوبہ بندی کرنے لگا۔ مسلمان ممالک کو استعمار کی کالونی بنانے کے لئے یورپ کو تقریباً ڈیڑھ صدی لگی اور استعماری قبضہ کے بعد بلا مبالغہ کروڑوں صفحات اس

مقصد کے لئے سیاہ کئے گئے کہ ''نعوذ باللہ'' اسلام جارح، خون ریز اور تشدد پسند دین ہے۔ یہ تلوار کے زور پر پھیلا ہے۔ محمد ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن لے کر اقوام کو فتح کرنے نکلے کہ تلوار قبول کرلو یا قرآن۔

اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لئے اور دینِ فطرت کی حیثیت سے اسلام کی اشاعت کا راستہ روکنے کے لئے یہود، ہنود اور نصاریٰ سب مل کر اس مقصد کے لئے آگے بڑھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف یورپ میں اسلام کے خلاف بے بنیاد مواد پر مبنی کتب کے انبار اور دوسری طرف یورپ اور ہندوستان میں قصداً عمداً توہین رسالت کا ارتکاب کیا جانے لگا۔ ماضی قریب میں ہندوستان میں راجپال، سوامی دیانند، اور حال میں رشدی، تسلیمہ نسرین اور گیرٹ ولڈرز جیسے ملعونین اسی خبیث فکر کا تسلسل ہیں۔

ہندوستان پر برطانوی راج کے دوران غلام قادیانی کو جھوٹے دعوائے نبوت کے ساتھ کھڑا کیا گیا تا کہ مسلمانوں کے عقیدہ اور جذبۂ جہاد کو ختم کیا جاسکے۔ علامہ اقبالؒ نے اس وقت کے اس عظیم فتنہ کا کیا جواب دیا ہے، ملاحظہ ہو۔

تعلیم اس کو چاہئے ترکِ جہاد کی ــــ دنیا کو جس کے پنجۂ خونین سے ہو خطر
باطل کے فال وفر کی حفاظت کے واسطے ــــ یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر
ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے ــــ مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر

لیکن ہمارے ہاں تو اب جناب ''شیخ'' کا فتویٰ ہے کہ یہ زمانہ انفارمیشن ٹکنالوجی اور گلوبلائزیشن کا ہے لہذا دنیا میں تلوار توپ وتفنگ، جے ایف تھنڈر ۱۷، نیوکلیئر ٹیکنالوجی وغیرہ کی باتیں کرنا تشدد پسندی ہے۔ اقبالؒ نے اس زمانے میں یورپ کی نفسیات کا ایسا محاکمہ کیا ہے کہ آج بھی ایک ایک لفظ صحیح ہے۔

مسلمانوں نے قرآن کریم پر عمل کب کیا ہے کہ وہ تشدد پسند بن گئے۔ مسلمانوں نے قرآن وحدیث پر عمل کرنا شروع کیا تو دنیا بھر سے دہشت گردی جڑ سے اکھڑ جائیگی۔ اب تو مسلمان کا حال یہ ہے کہ پاکستان نیوکلیئر ملک ہونے کے باوجود اپنی خودمختاری برقرار رکھنے کے لئے قربانیاں دے رہا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ بقول اقبال۔

تیغ وتفنگ دستِ مسلمان میں ہے کہاں
ہو بھی دِل ہیں موت کی لذت سے بے خبر

مسلمان اللہ کی راہ میں موت کی لذت سے بے خبر ہیں اس لئے کبھی مضحکہ خیز خاکے بنتے ہیں اور کبھی گیرٹ ولڈرز منحوس کی منحوس فلم فتنہ منظر عام پر آتی ہے۔ ہمارے ہاں بعض دانشور یہ بات ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں کہ یہ یورپ کے بعض افراد کا انفرادی عمل ہے۔ لہذا اس کا پورے مغرب کو دوش دینا مناسب نہیں۔ اسلام واقعی ایک آدمی کا وبال پوری قوم پر نہیں ڈالتا لیکن میں کیسے مان جاؤں کہ۔۔۔ یہ ایک آدمی کا انفرادی فعل ہے۔ ایک آدمی کو روکنے کے لئے کوئی حکومت، کوئی تنظیم، کوئی NGO اور کوئی قانون موجود نہیں۔

کیا فرانس میں ابھی کل واقعہ کے پیچھے بھی ایک آدمی ہے کہ الجزائر کے ایک بچے کو ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام کے لئے منتخب کرنے کے بعد پروڈیوسر نے اس لئے ڈراپ کیا کہ اس بچے کے نام میں ''اسلام کا لفظ آتا تھا''۔ پروڈیوسر نے علی الاعلان کہا کہ ''فرانس کے لوگ یہ لفظ (اسلام) پسند نہیں کرتے''۔

ابھی کل ہی کی بات ہے کہ جادو سر چڑھ کے بولا ہے۔ افغانستان کے کٹھ پتلی صدر حامد کرزئی نے افغان ٹیلی ویژن پر ہندوستان کے پانچ ڈراموں اور بعض فلموں کو نہ دکھانے کا حکم ان تحفظات کے ساتھ دیا ہے کہ یہ ہمارے مذہبی اقدار کے خلاف ہیں۔ ان ڈراموں میں ایک عورت کو چار مردوں سے شادی کا حق مانگتے ہوئے دکھایا گیا ہے کیونکہ اسلام میں مرد کو چار شادیوں کی اجازت ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور ڈرامے میں بغیر باپ کے بچے پیدا کرنا عورت کا بنیادی حق بتایا گیا ہے۔ ہم خود بھی ایسے لوگوں کو شعیب منصور کی فلم ''خدا کے لئے'' کے ذریعے راہ دکھاتے ہیں۔ کیا اس کے پیچھے بھی ایک آدمی ہے؟ نہیں حضور! نہیں۔ اس وقت امریکہ، مغرب، اسرائیل اور ہنود مکمل یکجہتی اور منصوبہ بندی کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے درپے ہیں اور ہم ہیں کہ شتر مرغ کی طرح ریت میں اپنا سر چھپا کر مطمئن ہونے کی سعی ناکام میں لگ جاتے ہیں کہ میں کسی کو نہیں دیکھتا تو مجھے کوئی کیوں دیکھے گا؟

ے بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہمیں کوئی ستائے کیوں؟

☆......☆......☆

فتنہ [۲]

برطانیہ نے اس زمانے میں جب اس کا سورج غروب ہی نہیں ہوتا تھا، اپنے سکالروں اورمشنریوں کے ذریعے ایشیا اورافریقہ میں ان دو براعظموں کی تہذیب وتمدن اور بنیادی عقائد چھیڑنے کے لئے ایک ایسی مہم چلائی جو آج بھی جاری ہے۔اس کی نئی شکل حکومتی سطح پر امریکہ اور یورپی یونین تھینک ٹینکس اوراین جی اوز کی صورت میں چلا رہے ہیں۔ انہوں نے امتِ مسلمہ کو چار طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ جدیدیت پسند (Modernist) روایت پسند (Traditionalist)اور بنیاد پرست (Fundamentalist)اوردہریت پسند(Ethiest)ان میں سے جدیدیت پسنداوردہریت پسندتو ان کے ہم پیالہ وہم نوا ہونے کی بناء پرکام کے لوگ ہیں۔ہمارے ہاں پچھلے کئی سالوں سے یہ ''روشن خیالی'' کی ہوااسی کے طفیل چلی تھی۔امریکہ اور یورپی یونین ان لوگوں کو ہر طرح سے سپورٹ فراہم کرتا ہے۔لہٰذا اس کیمپ میں رہنے والے لوگ انفرادی، اجتماعی اور حکومتی سطح پر وہی کرتے ہیں جو ان کے آقاؤں کو مطلوب ہوتا ہے۔کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ عوامی غیض وغضب کی صورت میں مغرب اور امریکہ ان لوگوں کو پناہ (Refuge) بھی مہیا کرتا ہے۔روایت پسندوں کے لئے بھی جدید عالمی نظام میں بقائے باہمی کی گنجائش ہے کیونکہ یہ حضرات اپنی دنیا میں مست ہونے کی بناء پر بہت کم مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور معاشی احوال پر بات کرتے ہیں لہٰذا ان کے ساتھ مغرب وامریکہ کا اختلاف واقع نہیں ہوتا۔

اصل مسئلہ ان مسلمانوں کا ہے جن کو امریکہ اور یورپ کبھی قدامت پسند، کبھی رجعت پسند، کبھی بنیاد پرست اور کبھی کبھی دہشت گرد بھی کہتا ہے۔اس قسم کے مسلمان واقعی ذرا مشکل ثابت ہوتے ہیں کیونکہ ان لوگوں کا اصرار یہ ہوتا ہے کہ چونکہ ہم مسلمان ہیں اور اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جس کی بناء پر اس کا تقاضا یہ ہے کہ زندگی کے سارے شعبوں میں اللہ تعالیٰ اور آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے روشنی ورہنمائی لے کر اطاعت کی راہ اپنائی جائے۔ یہ لوگ انفرادی اوراجتماعی معاملات میں اسلام کے بنیادی اصول واحکامات جاری وساری دیکھنا چاہتے ہیں۔گو کبھی کبھار یہ حضرات علمی تنوع کی بناء پر ہم عصر تقاضوں کی روحانی ضرورت کو کسی وجہ سے نظرانداز کرکے بعض مقامات پر مشکلات پیدا کرنے کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔لیکن

ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اسلام پر عمل پیرا ہو کر ایک دفعہ پھر اسلام کی عظمتِ رفتہ کو بحال کیا جا سکے۔

امتِ مسلمہ کو ایک باوقار مقام دلانے کے لئے اسلامی تعلیمات واحکامات پر اصرار کرنا اوران احکامات کی روشنی میں اسلامی معاشرہ کی تشکیل بہت اہمیت کا حامل ہے لیکن اس کے لئے جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ مغرب اور مسلمانوں کے درمیان سخت نزاع کا باعث بنا ہوا ہے۔ امریکہ اور مغرب کا دعویٰ ہے کہ موجودہ سائنسی ترقی، جمہوری نظام اور مغربی تہذیب وتمدن (جس میں انسان کی مادر پدر آزادی بھی شامل ہے) انسانیت کی ترقی یافتہ ترین شکل ہے۔ لہذا اس کے متوازی کوئی اور نظام قائم کرنا اور پھر خاص کر اسلامی نظام یا شریعت کا نظام قائم کرنا قطعاً فٹ نہیں بیٹھتا۔ اسلامی نظام تو موجودہ مغربی نظامِ حکومت اور معیشت کے خلاف ہے ہی، مغرب اور امریکہ تو اس وقت ٹاپ کے دہری (Ethiest) چینیوں کے نظام معیشت کو بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا مقابل (Counter) نظام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چین میں انتشار پیدا کرنے کے لئے کبھی تائیوان کو ابھارا اور اکسایا جاتا ہے اور کبھی اولمپک گیمز جیسے اہم موقع پر تبت کے لوگوں کو مظاہروں کی ترغیب دی جاتی ہے۔

عالم اسلام کو بالعموم اور پاکستان کو بالخصوص اس وقت یہی مسئلہ درپیش ہے چونکہ اس وقت امتِ مسلمہ ایک انتقالی (Transitional) دور سے گزر رہی ہے اور ساری دنیا میں مغربی استحصالی اور جلب زر (Snatching of Wealth) کی بنیاد پر قائم نظامِ معیشت کے خلاف ایک سخت ردِ عمل کی شروعات ہو چکی ہیں اور خود اقوامِ متحدہ اور مغربی دنیا میں جی ایٹ (G-8) ممالک اور ان کی معاشی پالیسیوں کے خلاف اقدامات منظر عام پر آ چکے ہیں لہذا اس وقت مغرب کی پوری پوری کوشش ہے کہ انسانیت کے لئے مغربی نظامِ معیشت کے مقابلے میں ایک بہترین متبادل کے طور پر موجود اسلامی نظام کی ہوا کسی کو لگنے نہ پائے۔

اس مقصد کے حصول کے لئے گاجر اور ڈنڈے کے استعمال کے ساتھ ساتھ مشرقی اور مغربی دونوں محاذوں پر علماء، سکالروں، دانشوروں، میڈیا اور مؤثر مقامات پر خواتین وحضرات کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ مغرب کی طرف سے یہودی میڈیا کے ذریعے اسلاموفوبیا (Islamophobia) پیدا کرنا، رشدی اور تسلیمہ نسرین اور گیرٹ ولڈرز جیسے تھرڈ کلاس لوگوں کو اسلام کے خلاف استعمال کرنا اور اسلامی ممالک میں نصابات (Syllabai) کو اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کرنا وغیرہ شامل ہیں۔

پاکستان چونکہ ایک اہم اسلامی ملک ہے لہذا شروع دن سے امریکہ اور مغرب کی اس پر خاص نظرِ کرم ہے۔اسی نظرِ کرم کے طفیل پاکستان میں ایسے دانشوروں اور فضلاء کی کمی نہیں جو چند ڈالروں کے عوض اپنا نصاب تعلیم تو کیا اپنا سب کچھ تبدیل کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔لیکن اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل وکرم ہے اور یہی دین اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین متین کی حفاظت کے لئے ہر زمانے میں کسی نہ کسی کو اٹھا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں سینیٹر بابر اعوان صاحب نے گیرٹ ولڈرز کی بدنامِ زمانہ ''فتنہ'' فلم کے خلاف ایک ایسی فلم بنانے کا ارادہ کیا ہے جو غیر جانبدار اور غیر متعصب لوگوں پر اسلام کی حقیقت آشکارا کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوگی۔اس بات میں کوئی دوسری بات ہو ہی نہیں سکتی کہ بے بنیاد الزامات اور ہفوات و ہزلیات کا جواب نہ دے کر برائی کو خاموشی کے ساتھ قتل کرنا بھی ایک طریقہ ہے لیکن جھوٹ کو برہانِ قاطع سے کاٹ دینا بھی افضل جہاد ہے۔ یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ ڈاکٹر بابر اعوان صاحب نے پاکستان کے تمام مکاتبِ فکر کے ماہرین کو اس میں دامے درمے سخنے مدد کرنے کی دعوت دی ہے۔لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اس ایک فلم پر بس نہ کیا جائے بلکہ سارے اسلامی ممالک کے وسائل کو استعمال میں لانے کے لئے ایسے ادارے بنائے جائیں جو مستقل بنیادوں پر مغرب کی طرف سے اٹھے ہوئے طوفان اور یلغار کا راستہ روک لے۔

پاکستان کی ساری یونیورسٹیوں میں ایسے شعبے قائم کئے جائیں جو مغرب کی جامعات کی سطح پر تحقیقی انداز میں ایسی کتب اور مواد تیار کریں کہ مغرب کے بعض نام نہاد دانشور جب کبھی اسلام پر اس قسم کے رکیک حملے کریں تو جواب موجود ہو اور دنیا بھر کے نشریاتی اداروں کے ذریعے عام کیا جا سکے۔

اس کے علاوہ سارے اسلامی ممالک کا فرض بنتا ہے کہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹیوں میں سارے اسلامی ممالک کے سکالروں، دانشوروں اور علمائے کرام پر مشتمل ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جس میں حنفی مکتب کے مفروضہ سولات کے طرز پر مستقبل میں پیش آنے والے مسائل کے حوالے سے تحقیقی مواد منظر عام پر لایا جا سکے۔

اسلام ممالک کے مغربی سفارتخانوں میں کلچرل اتاشی کے عہدے پر فائز ہونے والا شخص محض بیوروکریٹ یا کوئی دوسرے درجے کا کوئی سفارشی ادیب نہ ہو بلکہ صحیح معنوں میں ایک با عمل مسلمان اور عالم فاضل شخص ہو جس کو عربی اور انگریزی زبانوں پر عبور حاصل ہو تا کہ یورپی ممالک سے اٹھنے والے فتنوں کا

بروقت وہاں کے میڈیا پر وقت حاصل کر کے جواب دے سکے۔

اور بہت ساری باتیں اور تجاویز اس سلسلے میں ہوسکتی ہیں لیکن سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ اگر ہم سب خود اسلام پر عمل کرنا شروع کر دیں اور اسلامی ممالک اسلام کے زریں اصولوں کے مطابق دنیا کے سامنے وہ کامل نمونہ پیش کریں جو سرکارِ دو عالم ﷺ ساری انسانیت کے لئے چھوڑ چکے ہیں تو سارے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔

ورنہ ڈاکٹر حقی حق مرحوم کے مطابق: ہمارا مرنا دونوں طرح سے ہے۔

''ہم جن کے ساتھ ہیں وہ ہم سے اس ساتھ کی قیمت لگائے بیٹھے ہیں اور اس ساتھ میں ہم جن کے خلاف ہو گئے ہیں وہ ہم سے مخالفت کا معاوضہ مانگتے ہیں۔ تاریخ کہتی ہے کہ ہمیں ہر دونوں کو یہ ادائیگی سروں کی جنس میں کرنا ہوگی۔ عندالطلب فصل سر کٹے گی تو یہ ادا ہوگی اور قرائن کہتے ہیں کہ بالآخر یہ معرکہ، یہ آخری جنگ اس سرزمین میں تمام ہوگی''۔

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اس کا آسمان کیوں ہو

☆......☆......☆

اسلامی تاریخ کا المناک باب

میں جب کبھی اسلامی تاریخ کے ان واقعات کو پڑھتا ہوں جو ہمارے زوال بلکہ ذلت کا سبب بنے تو میں سوچنے لگتا ہوں کہ آخر اتنے بڑے بڑے مناصب اور عہدوں فائز لوگ اپنی ذات، انا، اقرباء اور اپنے مفادات سے اوپر کیوں نہ اٹھ سکے۔ آیا یہ اقتدار اتنی بڑی چیز ہے جس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی عظیم ذات جناب رسول اللہ ﷺ کی مقدس تعلیمات اور حیاتِ طیبہ کے واقعات اور امتِ مسلمہ کے لئے آپؐ کے مواعظ ونصائح سب ماند پڑ گئے اور آپس میں بھائی بھائی کی حیثیت سے ایک جسم کی مانند ہوتے ہوئے کیوں ایک دوسرے کو کاٹنے لگے۔

میں سوچنے لگتا ہوں کہ آخر بنوامیہ کی مضبوط حکومت جن کے اسلاف نے کبھی قسطنطنیہ پر بحری بیڑوں کے پھریرے لہرائے تھے، کیوں اپنے اندرونی کشمکش کے ہاتھوں نوے سال کے اندر اندر صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جیسی شخصیت کو (جن کے مبارک عہد میں مسلمانوں میں زکوٰۃ کا مستحق نہ ملتا تھا) اپنوں کے ہاتھوں راہی عدم ہوئے۔

بنوعباس نے بنوامیہ کی جمی جمائی حکومت کو جس انداز میں کمزور کر کے ختم کیا اور پھر بنوعباس کے پہلے حکمران ابوسفاح منصور نے مؤرخین کے بقول بنوامیہ کے جن سرکردہ افراد کی نیم بسمل حالت میں قالین بچھا کر فتح کا جشن منایا، اسلامی تعلیمات میں کہیں بھی اس کے جواز کا شائبہ مل سکتا ہے۔

بنوعباس کے زوال میں خود گھر کے بھیدی اور حکومت کے اہم رکن ابن علقمی نے ہلاکو خان کو بغداد پر حملہ آور ہونے میں جو کردار ادا کیا اس کے لئے انسانیت کی لغت میں کوئی گنجائش ہے۔

ہندوستان پر بڑی قربانیوں اور محنت کے بعد قائم ہونے والی مسلم سلطنت کے حکمران ظہیر الدین بابر کے مقابلے میں پانی پت کے مشہور میدان میں ابراہیم لودھی کیا مسلمان نہیں تھا؟ اور ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے کہ ظہیر الدین بابر کو فرغانہ سے نکلنے اور ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی دعوت دینے والے ابراہیم لودھی کے اپنے ہی خاندان کے افراد تھے کوئی عیسائی، یہودی یا ہندو نہیں تھے۔

اسی طرح نصیر الدین ہمایوں اور شیر شاہ سوری کے درمیان خون ریز جنگوں میں مسلمانوں کا جو نقصان ہوا

وہ تو ہوا، تاریخ کے اوراق پر یہ المیہ اب بھی موجود ہے کہ ہمایوں کو ہندوستان سے بھگانے اور ان کے حرم کی مستورات کی خانہ بدوشی میں ان کے سگے بھائی شیر شاہ سوری کا ساتھ دے رہے تھے۔ پھر جب ہمایوں نے دوبارہ شیر شاہ سوری کو ان کے اپنے بھائی بندوں کی ''آشیرواد'' سے شکست سے دوچار کیا تو اپنے ان بھائیوں کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیروا ڈالیں تاکہ وہ پھر کبھی عہد ہمایونی پر نظر بد نہ ڈال سکیں۔

ایرانی سلاطین اور بادشاہوں اور شہنشاہوں نے خلافت عثمانیہ کو کمزور کرنے میں جو کردار ادا کیا اور وہ تاریخ کے صفحات میں اب بھی محفوظ ہے۔ مسلمانوں کی عظیم اور آخری خلافت، عثمانی خلافت کے خلاف حجاز جیسے مقدس خطے کے عثمانی گورنر حسین شریف آف مکہ نے لارنس آف عریبیا کے شیشے میں اتر کو جو کردار ادا کیا اور عرب و عجم کے نشے میں بدمست ہو کر ترکوں کو برطانویوں کے ہاتھوں جو نقصان پہنچایا اس کا نتیجہ قیام اسرائیل کی صورت میں نکلا جو عربوں کی کی پیٹھ میں خنجر کی طرح گھونپا ہوا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آپس کی نااتفاقی کے ہاتھوں میسور کی غیور و جسور شخصیات حیدر علی اور ان کے شیر دل بیٹے سلطان فتح علی ٹیپو کی شہادت میر صادق ہی کے ہاتھوں واقع نہ ہوئی۔ میر جعفر لارڈ کلائیو کی تعمیر کردہ سبز باغ میں گم ہو کر ہوش و حواس نہ کھوتے اور اپنے قریبی رشتہ دار سراج الدولہ کی شہادت کا سبب بنتے تو شاید ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت اس طرح زوال سے دوچار نہ ہوتی کہ عظیم مغل سلطنت کے آخری حکمران کے شہزادوں کے سران کے بوڑھے باپ کو طشتری میں پیش کئے گئے اور خود ان کو زندگی کے آخری ایام رنگون کی جیل میں گزر کر ہندوستان کی عظیم مغل سلطنت کو یاد کرتے ہوئے دو گز زمین کے لئے ترس ترس کر لقمۂ اجل ہوئے۔

اسلامی تاریخ کا یہ باب اتنا طویل، سیاہ اور تلخ ہے کہ انسان پڑھنے لگے تو سر پیٹنے اور سینہ کوبی کو دل چاہتا ہے۔ اور ایک حساس، بے اختیار اور عام مسلمان پکار اٹھتا ہے کہ آخر ان سارے المناک، ہیبت ناک اور دردناک واقعات کو امت مسلمہ کی تاریخِ حصہ بننے سے روکنے کے لئے لاکھوں کروڑوں انسانوں میں کوئی بھی رجل رشید (راہ راست) والا آدمی نہیں تھا۔

سپین پر عظیم، شاندار اور بے مثال اسلامی سلطنت کی تاریخ کا حال پڑھتا ہوں تو دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے کہ آخر ان عرب مسلمان حکمرانوں کو بھی شرم نہیں آئی کہ اتنی عظیم سلطنت کو اپنی اپنی انا کی تسکین اور دنیاوی عیاشیوں کے لئے چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم در تقسیم کرتے ہوئے ان کی بقاء اور تسلسل کے لئے

عیسائی حکمرانوں اوران کے وارلارڈز سے مدد مانگتے رہے یہاں تک آخران کی حکومتیں ان کے رحم وکرم پر رہ گئیں اور پھرایک وقت وہ بھی آیا کہ سینکڑوں ہزاروں مسلمانوں کو بحری جہازوں میں بھرکرعین منجدھار میں ڈبوکر فرسٹ اپریل فول منایا گیااور مسلمان خواتین کوفرڈی نینڈ اور ملکہ آزابیلا کی عیسائی افواج اشبیلیہ اورغرناطہ کی گلیوں میں نیم برہنہ ہانک کران پراپنے شراب کے بھرے چھاگلوں سے منہ بھربھرکرشراب کی کلیاں کرتی رہیں۔

مسلمانوں کی تاریخی سیاہ بختی ملاحظہ کیجئے کہ جہانگیر بادشاہ، جس کا نام عدل جہانگیری کے ساتھ مشہور ہے، نے اپنے بیٹے خسروکوجس سے اس کو بے پناہ محبت تھی، اندھا کردیا تا کہ اس کی بادشاہت کا سنگھاسن تاحیات سلامت رہے۔

بایزید یلدرم، جو یورپ کے لئے کڑکتی بجلی کے نام سے مشہور تھا، اپنے ہی مسلمان بھائی امیر تیمور کے ہاتھوں زچ ہوکراپنی ریاست میں محدود ہوکررہ گیا۔

عظیم مملکتِ خداداد پاکستان کا اپنوں کے ہاتھوں دولخت ہونے کا زخم تو ابھی تک رِس رہاہےاوراب خیر سے حسینہ واحد بنت مجیب الرحمٰن عالمی عدالت میں پاکستانی افواج پرجنگی جرائم کے تحت مقدمات قائم کرنے کا عندیہ دے رہی ہے۔

عراق، افغانستان اوراب پاکستان میں کیا ہم آپس میں بدست وگریباں ہوکرکیا نیٹو افواج اورسی آئی اے، موساداور راوخادو کے جی بی وغیرہ کی متحدہ خفیہ اوراعلانیہ سازشوں، ریشہ دوانیوں اورمکروفریب کوایک دفعہ پھرسارے مسلمان ممالک کیخلاف بالعموم اوروطن عزیز پاکستان کے خلاف بالخصوص (کہ واحد اسلامی ایٹمی طاقت ہونے کی بناء پرعدوواغیار کی آنکھوں کا کانٹا ہے)۔خدانخواستہ خودکہیں نادانستگی میں توکوئی ایسا موقع فراہم نہیں کررہے ہیں جومملکت خداداد کے لئے کہیں ایسا نقصان دہ ثابت نہ ہوجائے جس پرہماری آنے والی نسلیں اسی طرح کُڑھنے پرمجبور ہوں جس طرح ہم اپنی تاریخ کے سیاہ ابواب پرآج ماتم کناں ہیں۔

میں جب آج ہمارے صوبے کے شمالی اضلاع کے متاثرین کے حوالے سے ایم کیوایم، جسقم وغیرہ کے عزائم اوراعلانات سنتااور پڑھتاہوں توسہم جاتاہوں کہ یااللہ! یہ ہمیں کیا ہوگیا کہ ایک ہی ملک میں سیاست اس حدتک سنگدل ہوگئی ہے کہ ہم شدیدتکالیف ومصائب سے دوچاراپنے بھائیوں اور بہنوں کے نام پربھی سیاست کرنے سےنہیں چوکتے۔

اسلامی ملک میں اسلامی تعلیمات کے پیش نظر سیاست کا مطلب کسی بھی طرح یہ نہیں ہوسکتا کہ سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کی دشمن بن جائیں۔ اسلامی سیاست کی بنیاد یہ ہے کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ لہٰذا وہ ایک دوسرے کے دشمن کسی حال میں نہیں ہوسکتے۔ البتہ حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی حیثیت میں نیک، تعمیری اور سیدھے کاموں میں حزب اختلاف کی ساری جماعتیں حزب اقتدار کے تعاون اور مدد کے لئے تیار رہتی ہیں اور اگر حزب اقتدار راہِ حق وراہ راست سے بھٹکتی ہے تو حزب اختلاف اسے راہِ راست پر رکھنے کے لئے اپنی طاقت استعمال کرتی ہے۔ اسلام میں کہیں بھی اس بات کا جواز نہیں ہے کہ سیاست، مفادات، نظریات، عقائد اور مسالک کے نام پر اختلافات اس حد تک وسیع کئے جائیں کہ نہ صرف ملک کی سالمیت کو خطرات درپیش ہوں اور دشمن قوتیں اس تاک میں ہوں کہ کب یہ مسلمان آپس میں لڑلڑ کر اس حد تک کمزور ہوں گے کہ ہم کو ان پر جھپٹنے کا موقع ملے۔

آج پاکستان جن حالات سے دوچار ہے اس میں ساری سیاسی اور مذہبی جماعتوں اور ہر فرد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ سارے اختلافات ومفادات بھلا کر اور اپنی اپنی اناؤں کے خولوں سے نکل کر صرف اور صرف اسلام اور پاکستان اور پاکستان کی عوام کی بھلائی کے لئے یک جان ودو قالب ہوکر ملک وقوم کی حفاظت وسلامتی میں اپنا کردار ادا کرے تاکہ ہم اپنی تاریخ کے بدترین دور سے بخیر وخوبی نکل کر خیر وبھلائی اور ترقی وکامیابی کی راہ پر گامزن ہوسکیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وطن عزیز اس پرآشوب وپرفتن دور سے بخیر وخوبی نکل جائے اور ہمارے لاکھوں بہن بھائی کیمپوں کی ناگفتہ بہ زندگی سے نجات پاکر پھر سے محبت، امن اور سلامتی کی ساتھ اپنے اپنے گھروں کو سدھاریں۔ آمین یارب العالمین۔

بموں کی آنکھیں نہیں ہے جو دیکھ کر پھٹیں
اور اپنے ٹکڑوں کو بے گناہوں سے دور پھینکیں

☆......☆......☆

جب برطانیہ سپر پاور تھا!

جب برطانیہ کی سلطنت کے حدود نے اتنی وسعت اختیار کی کہ وہاں سورج غروب ہی نہیں ہوتا تھا، تو حکومتِ برطانیہ کی بھرپور کوشش تھی کہ اپنی عظیم نوآبادیوں پر اپنا قبضہ اِسی طرح مستحکم رکھا جائے تاکہ برطانیہ کا یونین جیک دُنیا پر لہراتا رہے اوراس کے طفیل وسائل کے چشمے برطانیہ کی طرف بہتے رہیں، لیکن اپنی نوآبادیوں کے مقابلے میں برطانیہ ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا لہٰذا وہ اُس کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ایسی پالیسیاں بنا کر نوآبادیوں پر نافذ کیجائیں کہ جن نوآبادیوں پر برطانیہ کا قبضہ ہے وہ مستحکم ہو جائے اور جہاں ابھی قبضہ نہیں ہوا ہے وہاں درپردہ ایک ایسا سامراجی نظام کارفرما کیا جائے کہ عنانِ حکومت ظاہراً وہاں کے لوگوں کے ہاتھ میں دکھائی دے لیکن وہاں جاری سامراجی نظام کے زیرِاثر وہ ممالک اپنی ظاہری آزادی کھوکر برطانیہ کی گود میں چلے آئیں۔

اِس مقصد کے حصول کیلئے برطانیہ کے خارجہ امور کے اہلکاروں نے جو پالیسیاں بنائیں اُس میں دو اہم نکات قابل ذکر ہیں۔

ا۔ برطانوی حکومت ایسی تدابیر اختیار کرے جو سلطنت انگلستان کی نوآبادیوں میں اِس کے عمل دخل اور قبضے کو مستحکم کرے۔

۲۔ جن علاقوں اور ملکوں پر ابھی تک نوآبادیاتی نظام قائم نہیں ہوا وہاں ایسے پروگرام مرتب کئے جائیں جن کے ذریعے وہاں برطانیہ کی تہذیب وتمدّن رائج اور اثر ورسوخ قائم ہو۔

ان دو نکات کے ذریعے مقاصد کے حصول کیلئے انگلستان کی نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت نے مذکورہ بالا پروگراموں کو روبہ عمل لانے کیلئے اِس بات کی ضرورت محسوس کی کہ وہ نوآبادیاتی علاقوں میں جاسوسی کا جال بچھائے اور حصولِ اطلاعات کیلئے وفود بھیجیں۔ برطانیہ نے اُس زمانے میں جاسوسی اور اطلاعات کے حصول کیلئے ھندوستان اور چین کی بجائے جو بذات بہت بڑے علاقے تھے، ترکی اور ایران پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ اِس کی بڑی وجہ بعد کی کتب میں یہ سامنے آتی ہے کہ چین میں بدھ اور کنفیوشس جیسے مردہ اور اپنے حال میں مست مذاہب کے پیروکاروں کی طرف سے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ جب کہ ھندوستان میں قومی، مذہبی اور ثقافتی اختلافات کے پیشِ نظر یہ بات بعید از قیاس تھی کہ وہاں کے رہنے والوں کو اپنی آزادی اور استقلال کی فکر

کبھی دامنگیر ہو۔لیکن پھر بھی حفظِ ماتقدم کے طور پر اِن علاقوں میں بھی ایسی تدابیر اختیار کی گئیں جن سے اِن قوموں میں بیداری کی صلاحیت مفقود ہوجائے۔ برطانیہ نے اپنی اِن کالونیوں میں طویل المیعاد پروگراموں کی صورت میں افتراق وانتشار اور غربت کی بنیاد پر استوار کیئے۔

برطانیہ نے اپنے جاسوسی نظام کے ذریعے اسلامی ملکوں بالخصوص ترکی اور ایران کو جس طرح کمزور کیا، اس کا اعتراف اُس زمانے کے ایک مشہورِ زمانہ جاسوس "ھمفرے" نے اِن الفاظ میں کیا ہے۔" ہمارے جاسوس اسلامی مما لک میں عثمانیوں اور اِسی طرح ایرانیوں کے زیر اثر سرگرم عمل رہے، اور باوجود اِسکے کہ اُنہوں نے انگریزی حکومت کے مقاصد میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں اور دفتروں کے نظام کو بگاڑ کر رشوت ستانی عام کردی۔ بادشاہوں کیلیئے عیش وعشرت کے سامان فراہم کیئے اور اِس طرح اِن حکومتوں کی بنیادوں کو کسی حدتک پہلے سے زیادہ متزلزل کیا تاہم نوآبادیاتی علاقوں کے ماہرین نے اِس عظیم سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کیلیئے مہلت اس لئے بڑھادی کہ ابھی کچھ لوگوں میں اسلام کی حقیقی روح کا اثر ونفوذ موجود تھا جس نے انہیں بہادر، بے باک اور پُرعزم بنادیا تھا۔لیکن ہم عثمانی اور ایرانی حکومتوں کی دوراندیشوں، ہوشیاریوں اور کارروائیوں سے محفوظ نہیں تھے اور ہر آن یہی کھٹکا تھا کہ کہیں وہ ہماری سامراجی پالیسیوں سے باخبر ہوکر ہمارے کیلیئے دھرے پر پانی نہ پھیردیں۔لیکن دونوں حکومتیں بہت کمزور ہوچکی تھیں اور اُن کا اثر ورسوخ صرف اپنی سرزمین کی حدتک محدود تھا۔"

برطانیہ کے اس جاسوس نے اپنی حکومت کے وزیر نوآبادیات اور ایک مشہور پادری اور ۲۵ دیگر مذہبی سربراہوں کے ساتھ ایک اجلاس میں اُس مشہور پادری کے خطاب کو یوں بیان کیا ہے۔

" آپ لوگ اپنی ہمتیں پست نہ کریں، صبر اور حوصلہ سے کام لیں، عیسائیت تین سوسال کی زحمتوں اور دربدری کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ اور ان کے پیروکاروں کی شہادت کے بعد عالمگیر ہوئی۔ ممکن ہے آئندہ حضرت عیسیٰؑ کی نظرِعنایت ہم پر ہو اور ہم تین سوسال بعد کافروں (مسلمانوں) کو نکالنے میں کامیاب ہوں۔ پس ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنے آپ کو محکم ایمان اور پائیدار صبر سے مزیّن کریں اور اُن تمام وسائل کو بروئے کار لائیں جو مسلمان خطّوں میں عیسائیت کی ترویج کا سبب ہوں۔ اگر اِس میں ہمیں صدیوں کا عرصہ بھی گزرجائے تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں، آباؤ اجداد اپنی اولاد کیلیئے بیج بوتے ہیں۔"

اسی طرح کے ایک اور کانفرنس جس میں روس، فرانس اور برطانیہ کے اعلیٰ رتبہ نمائندے شریک تھے، کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ "اِس کانفرنس کا موضوع اسلامی ممالک میں سامراجی نظام کی ترویج اور اِس میں پیش آنے والی دشواریاں تھا۔ شرکاء کے غور وفکر کا نقطہ یہ تھا کہ ہم کس طرح مسلم طاقتوں کو درہم برہم کر سکتے ہیں اور اِن کے درمیان نفاق کا بیج بو سکتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو اِسی طرح راہِ راست پر لایا جا سکتا ہے جس طرح سپین کئی صدیوں کے بعد عیسائیوں کی آغوش میں چلا آیا تھا۔ کیا یہ وہی ملک نہیں تھا جسے وحشی مسلمانوں نے فتح کیا تھا؟ حقیقتاً مشرق سے مغرب تک پھیلاؤ رکھنے والے عظیم اور تناور درخت (اسلام اور مسلمان) کی جڑوں کا کاٹنا اتنا آسان کام نہیں۔ پھر بھی ہمیں ہر قیمت پر اِن دشواریوں کا مقابلہ کرنا ہے کیونکہ عیسائی مذہب اُسی وقت کامیاب ہوسکتا ہے جب ساری دُنیا اُس کے قبضہ میں آجائے۔

حضرت عیسیٰؑ نے اپنے سچے پیروکاروں کو اِس جہانگیری کی بشارت دی ہے۔ حضرت محمد ﷺ کی کامیابی اُن اجتماعی اور تاریخی حالات سے وابستہ تھی جو اُس دور کا تقاضا تھا۔ مسلمانوں نے روم و ایران کی عظیم سلطنتوں کو زیر کیا، مگر اب حالات مختلف ہو چکے ہیں اور اسلامی ممالک بڑی تیزی سے روبہ زوال ہیں اور اِس کے مقابلے میں عیسائی روز بروز ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ عیسائی مسلمانوں سے اپنا بدلہ چکائیں اور اپنی کھوئی عظمت دوبارہ حاصل کریں۔"

برطانوی سلطنت کے یہ عزائم ۱۷۱۰ء میں تھے۔ برطانیہ نے مکمل دو صدیاں اِس نہج پر کام کیا تب کہیں جا کر مسلمانوں کی عظیم سلطنت عثمانیہ اور ھندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کو ختم کیا۔ برطانوی حکومت کا یہ جاسوس مسلمانوں کی اخلاقی صفات کا ذکر کرتے ہوئے اُس وقت عثمانی سلطنت کی کمزوریوں کا ذکر بھی کرتا ہے:

بہت ساری مشکلات کے باوجود میں اپنی کامیابی کے سلسلے میں ہراساں نہیں تھا کیونکہ میں مسلمانوں کی طبیعت سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ اِن کی کشادہ قلبی، حُسنِ ظن اور مہمان نواز طبیعت جو اُنہیں قرآن وسنت سے ورثے میں ملی تھی۔ دوسری طرف عثمانی حکومت اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ اب اُس کے پاس انگلستان اور غیر ملکی جاسوسوں کی کارروائیاں معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، اور ایسا کوئی ادارہ موجود نہیں تھا جو حکومت کو اِن نا مطلوب عناصر سے باخبر رکھ سکے۔ اِستعماری ملکوں کے یہ جاسوس مختلف لبادے اوڑھ کر مسلمان ملکوں کی زبانیں اُس زمانے میں بالخصوص عربی، ترکی اور فارسی ایسے انداز میں مسلمان علماء سے دینی علوم سیکھنے کی آڑ میں

سیکھتے کہ متعلقہ زبان کے قواعد ورموز کا کوئی نکتہ فروگذاشت نہ ہوتا اور مقامی آبادی اُن کے ترک، عرب یا ایرانی ہونے میں کوئی شک نہ کر سکتے۔ جاسوسوں کو دو باتوں کی خصوصی طور پر تاکید کی جاتی:

۱۔ مسلمانوں کی اُن کمزوریوں کی نشاندہی کرو جو ہمیں ان تک پہنچنے اور اُن کے مختلف گروہوں اور جماعتوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے میں کامیابی فراہم کرے کیونکہ دُشمن پر ہماری کامیابی کا راز ان مسائل کی شناخت پر منحصر ہے۔

۲۔ اُن کی کمزوریاں جان لینے کے بعد اُن میں پھوٹ ڈالنا ہے۔

کیونکہ اُن کو یقین تھا کہ جب تک اپنے نوآبادیاتی علاقوں اور مسلمان ملکوں میں نفاق، تفرقہ، شورش اور اختلاف کی آگ کو ہوا نہیں دی جائیگی، استعمار پُرسکون اور مرفّہ الحال نہیں ہوسکتا۔ مسلمانوں کو اُس وقت تک شکست نہیں دی جاسکتی جب تک اُن کے ملکوں میں شہر شہر، گلی گلی فتنہ وفساد برپا نہ کیا جائے، ورنہ سچ بتائیں کہ مسلمانوں کے اتنے بڑے ملکوں پر انگریزوں کی ایک مختصر اور چھوٹی سی قوم سوائے اِس ہتھکنڈے کے اور کس طرح چھا سکتی تھی۔

برطانوی جاسوسوں، لارنس آف عربیا ہمفرے اور نہ جانے اور کس کس نے مسلمانوں کے درمیان مختلف حیلوں حربوں کے ذریعے کیا کیا اختلافات، تفرقات اور تعصّبات اُجاگر کیئے۔ کیا ترکوں اور عربوں کے درمیان عربی اور عجمی کی تقسیم کے ذریعے بغداد سے فلسطین تک جانے والی ریلوے پٹڑی کو عربوں نے اپنے ہاتھوں سے نہیں اُکھاڑا اور اِسی کے نتیجے میں سقوطِ بیت المقدس ہوا تھا۔ یوں تو مؤمنوں کے بارے میں نوید یہی ہے کہ وہ ایک سوارخ سے دو دفعہ نہیں ڈسے جاتے لیکن ہم بار بار ایک ہی سوراخ یعنی آپس میں "افتراق و انتشار" سے ڈسے جا رہے ہیں۔ اِس لئے اللہ ہمیں معاف کرے، ہمارے ہاں۔۔۔ سقوطِ غرناطہ، سقوطِ دہلی (مسلم ہندوستان)، سقوط بیت المقدس، سقوطِ مشرقی پاکستان، سقوطِ بغداد اور سقوطِ؟۔۔۔ اللہ ہم کو کسی اور سقوط کا ذائقہ چکھنے سے محفوظ رکھے! کیونکہ آج کا سُپر پاور بھی اسلامی دُنیا کے نئے نقشے شائع کر چکا ہے۔ کیا آج مسلمان ملکوں میں آج کے سپر پاور کے جاسوس مختلف ناموں سے کام نہیں کر رہے۔ کیا آج مسلمانوں کے درمیان اُس زمانے سے بھی زیادہ اختلافات موجود نہیں۔ کیا اِن اختلافات کو ہوا دینے میں پڑوسی ملک افغانستان میں ہمارے یہ "بن بلائے مہمان" اہم کردار ادا نہیں کر رہے۔ اگر ایسا ہے اور میرے نزدیک یقیناً ایسا ہے تو ہمیں آج ایک بار پھر قرآن وسنت کی روشنی میں سوچنا ہوگا کہ مِل کر اللہ کی رسی کو پکڑنے کے کیا معنی ہیں؟۔

مغرب اور اسلامی دُنیا کی تاریخ

مغرب کے ساتھ اسلامی دُنیا کے تعلقات اور میلاپ کے حوالے سے تاریخ کے دو حوالے بہت اہم ہیں۔ سپین پر مسلمانوں کی حکومت اور صلیبی لڑائیاں۔ مغرب اور اسلامی دُنیا کے درمیان اِس سے پہلے کوئی با قاعدہ تعلق موجود نہیں تھا۔

نبی ﷺ کی بعثت کے بعد عیسائی دُنیا نے اُس وقت سخت ردِ عمل کا اظہار کیا جب قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں یہود ونصارٰی کے بعض بنیادی عقائد اور اعمال کو غلط، بے بنیاد اور تعصب پر مبنی قرار دیا گیا۔ اِس کے جواب میں مغربی دُنیا بالخصوص ہالینڈ، فرانس، برطانیہ، اٹلی اور جرمنی کے پادریوں، مشنریوں، دانشوروں اور شعراء نے نبی ﷺ، صحابہ کرام، قرآن وحدیث، اسلامی تاریخ اور شخصیات کے خلاف اپنی اپنی حکومتوں کے زیرِ نگرانی ایک باقاعدہ اور منظّم مہم چلائی جس کے نتیجے میں لاکھوں صفحات پر مشتمل کتب وجود میں آئیں۔ اِس مہم کو بعد میں جو نام مِلا وہ استشراق (Orientalism) کہلایا۔ اِس مہم کے محرکات اور مقاصد میں اسلامی دُنیا کو مذہبی، تہذیبی، علمی اور سیاسی و معاشی لحاظ سے ظالم، جابر، استحصالی اور اپنے عقائد کو جبر و استبداد کے ذریعے نافذ کرنے والی ثابت کرنا چاہا۔

خاتم النبین ﷺ کا لایا ہوا پیغام جب چار دانگ عالم میں پھیلنے لگا تو عیسائی دُنیا جو اُس وقت دُنیا پر حکمران تھی اور سیاہ وسفید کی مالک تھی، نے اسلام اور مسلمانوں کا راستہ روکنے کی بھرپور کوشش شروع کی۔ حالانکہ یہ بات بہت دلچسپی کی حامل ہے کہ نبی ﷺ کی بعثت کے بعد اُس وقت کے عیسائی علماء اور بعض عام عیسائیوں نے نبی ﷺ کو بہت احترام دیا تھا۔ مدینہ منورہ میں یہودی علماء بھی نبی ﷺ کا بطور آخری نبی ﷺ انتظار کر رہے تھے۔

لیکن اسلامی تعلیمات و احکامات کی ترویج نے جہاں ابتدائی مراحل میں کفارِ عرب کو مخالفت اور دُشمنی پر اُکسایا وہاں دوسرے مرحلے پر یہود ونصارٰی اپنے مفادات پر پڑتی ضرب کی بناء پر تعصب کی وجہ سے جنگ وجدل پر اُتر آئے حالانکہ نبی ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے اسلام کے امن و سلامتی کے پیغام کو ہمیشہ ترجیح دی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اقدامی (Pre-emptive) جنگیں بہت کم ہیں اور زیادہ تر جنگیں دفاعی نوعیت کی رہی ہیں۔

اسلام نے دینِ حق کے طور پھیلنا تھا اور پھیل کر رہا لیکن انسانیت کی بدقسمتی ملاحظہ کیجئے کہ یہود ونصارٰی

نے خوف اور مفادات کے نقصان کے پیشِ نظر ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کی حالانکہ اسلام کی حقانیت کا اندازہ اِس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ یہود و نصارٰی (اہلِ کتاب) میں سے جب بھی کسی نے اسلام کا غیر جانبدارانہ نظر سے مطالعہ کیا ہے اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی دُنیا میں قبولیتِ اسلام کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ھندوستان، چین اور افریقی غیر مسلم دُنیا کے مقابلے میں قبولیت اسلام کی سب سے زیادہ شرح مغربی ممالک میں ہے۔ اِس سے یہ اندازہ بھی لگانا آسان ہے کہ دُنیا کی ساری آبادیوں کی نسبت اہلِ کتاب دینِ اسلام کے زیادہ قریب اور مانوس ہیں۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ صرف دُنیاوی مفادات کی بناء پر مغربی دُنیا اسلام کے روشن و تاباں تعلیمات کے خلاف ہو کر انسانیت کو بہت بڑے امتحان سے دو چار کر گئی ہے۔

تاریخ کے کسی بھی جھروکے سے آپ جھانکیں تو معلوم ہو گا کہ اہلِ اسلام نے اسلامی تعلیمات اور احکامات، الٰہی کے پیشِ نظر کبھی بھی غیر اسلامی دُنیا کے ساتھ مذھب اور تعصب و مفادات کی بنیادوں پر اختلافات پیدا نہیں ہونے دئے لیکن غیر اسلامی دُنیا بالخصوص یہود، ھندو اور نصارٰی نے ہمیشہ مسلمانوں کو کچلنے کیلئے بہانے تراشے اور تلاش کئے اور جب بھی موقع مِلا مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے سے دریغ نہیں کیا۔ غیر اسلامی دُنیا مسلمانانِ عالم پر ظلم و ستم اور بربریت میں بعض اوقات اِس حد تک چلی جاتی ہے کہ خود غیر مسلم دُنیا کے غیر جانبدار مورخین، علماء، دانشور اور صحافی پکار اُٹھتے ہیں کہ "یہ صریح ظلم ہے۔"

سپین پر مسلمانوں کی حکومت کی گرفت ڈھیلی پڑنے اور اُس کے نتیجے میں سقوطِ غرناطہ کے بعد جس طرح لاکھوں مسلمان مرد و خواتین کو بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اُتارا گیا اور پھر فلسطین پر ۱۹۱۷ء میں برطانوی قبضے کے بعد جس طرح وہاں کی مسلمان آبادی کے خون میں گھٹنوں گھٹنوں فاتح افواج کے گھوڑے چلتے رہے، اِس کا اندازہ خود برطانوی مورخ "آرنلڈ ٹوئن بی" کی لکھی ہوئی کتاب "A study of History" میں کیا جا سکتا ہے۔

مغربی اور بالخصوص برطانوی استعمار نے افریقہ کی مسلم و غیر مسلم آبادیوں کو جس طرح جانوروں کی طرح بحری جہازوں میں بھر کر امریکہ اور مغربی دُنیا پہنچایا اُس کی ٹیس امریکہ اور مغرب کی کالی نسل اب بھی محسوس کر رہی ہے اور شاید اسی بناء پر امریکہ کے صدر اوبامہ اپنے آبائی ملک گھانا میں اُس قلعے کو دیکھنے آئے تھے جہاں سے

کہیں اُن کے اباؤ اجداد کو بھی جہاز مین بھرا گیا تھا۔شاید وہ اپنی جڑوں (Roots) کی خوشبو سونگھنے آئے ہوں۔

اِس کے علاوہ موجودہ مسلمان مما لک میں سے جن پر بھی مغرب کی استعماری حکومتیں رہی ہیں وہاں اُنہوں نے اپنی حکومتوں کے دوران مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے ہیں اور اُن کا جو استحصال کیا ہے وہ آج بھی متعلقہٗ ملک کی تاریخ میں محفوظ ہے۔مسلمان مما لک میں افغانستان الجزائر، دمشق، پاکستان اور بعض دیگر مما لک نے استعمار سے آزادی کیلئے بہت بڑی قربانیاں دی ہیں۔

افغانستان کی تاریخ تو اِس لحاظ سے ایک خاص شان کی حامل ہے، اور اشترا کی روس سے آزادی کے حصول کیلئے پندرہ لاکھ افراد کی قربانی تو ابھی کل کی بات ہے اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔عراق میں چند برسوں کے اندر اندر لاکھوں مرد وعورتیں اور لاکھوں بچے استعماری طمع ولالچ کی بھینٹ چڑھ گئے۔

فلسفہٗ اقوام کی تاریخ کے مطابق قوموں کا عروج وزوال ایک فطری بات ہے،کبھی مسلمان بھی سپر پاور تھے،لیکن کوئی موٴرخ ٹھوس شواہد کی بناء پر یہ ثابت نہیں کرسکتا کہ مسلمانوں نے کبھی مذہب یا نسلی تعصب کی بناء پر غیر مسلم رعایا یا عوام کے ساتھ امتیازی سلوک کیا ہو۔جبکہ اِس کے برعکس غیر مسلم قوتوں کو جب موقع ملا ہے، مسلمانوں کو نہ صرف بے انتہا جانی و مالی نقصانات سے دوچار ہونا پڑا بلکہ استعماری قوتیں طویل مدتی منصوبہ بندی کے ساتھ اُن کے وسائل پر قبضہ کرنے کی کوششیں بھی کرتی رہی ہیں۔اِس سب کچھ کے باوجود استعماری قوتوں اور مما لک کی طرف سے مسلمان مما لک اور عوام کے ساتھ سب سے بڑی زیادتی یہ ہوتی ہے کہ ایک طرف مغربی حکومتیں دُنیا میں مذہبی ہم آہنگی اور تہذیبوں کے درمیان بقائے باہمی کا پرچار کرتے ہوئے نہیں تھکتیں جب کہ دوسری طرف مغرب کی اِن نام نہاد مہذب حکومتوں کی ناک کے نیچے مسلمانوں کے ساتھ بہت امتیازی اور بعض اوقات غیر انسانی سلوک کیا جاتا ہے۔جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مغربی حکومتوں اور عوام کے اذہان وافکار میں صدیوں سے منتقل آئی مخالف اسلام تعصب اب بھی موجود ہے ورنہ اِس کا کیا جواز ہے کہ ایک طرف انسانی آزادی اور بنیادی حقوق کے نام پر ہم جنس پرستی جیسی اخلاق باختہ افعال کو عدالتوں کے ذریعے قانونی تحفظ دیا جارہا ہے اور دوسری طرف اتنی تنگ نظری اور تعصب کا اظہا کیا جارہا ہے کہ محترمہ مرواشربنی جرمنی میں ایلکس نامی مذہبی دہشت گرد کے ہاتھوں محض اِس بناء پر شہادت کے مرتبے پر فائز ہوتی ہے کہ وہ حجاب پہنتی تھی۔ایک طرف کتے بلیوں کو زک پہنچانے والوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا راستہ کھلا رکھا گیا

ہے جبکہ دوسری طرف گوانتانا موبے میں محبوس انسانوں کو عدالت تک رسائی کے حق سے محروم رکھا جا تا رہا ہے، ایک طرف عورت کی آزادی کے نام پر عورت کو بغیر شادی کے "محبت کے علامت" (symbol of love) کے نام پر بچے پیدا کرنے کی اجازت ہے جبکہ دوسری طرف ڈاکٹر عافیہ صدیقہ جیسی پڑھی لکھی مہذب خاتون کو جرم ثابت ہوئے بغیر کئی سالوں سے سخت تعذیب سے گذارا جا رہا ہے۔ ایک طرف حق خودارادیت کے نام پر مسلمان ملکوں کے اٹوٹ حصوں کو الگ کر کے الگ غیر فطری ریاستوں میں تبدیل کیا جا رہا ہے جبکہ دوسری فلسطین، کشمیر جیسے علاقوں کو سالہا سال سے اِس بنیادی حق سے محروم رکھا جا رہا ہے، اِس کے علاوہ دُنیا میں اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جس میں امریکہ اور مغرب کے ڈبل سٹینڈرز ساری دُنیا کے سامنے ہیں۔ اِسی بناء پر لاطینی امریکہ سے لیکر جنوبی اور مغربی افریقہ تک اور مشرقِ وسطیٰ سے لیکر جنوبی ایشیاء اور وسطی ایشیاء تک اور امریکہ اور مغرب کی عالمگیریت کے خلاف مزاحمت جاری ہے اور اِس کشمکش میں دُنیا امن و سلامتی سے محروم ہے۔ امریکہ اور مغرب کو دُنیا کا امن عزیز ہے تو دُنیا والوں کے ساتھ انسانی بنیادوں پر اشتراک و تعاون کی راہ اپنانی ہوگی ورنہ یہیں کشمکش جاری رہے گی۔

☆......☆......☆

مینارِ مساجد کی مختصر تاریخ

مخروطی شکل میں بلند ستون اور چوڑائی میں ذرا کم تعمیر کو مینار کہتے ہیں۔ مینار مسلمانوں کی طرز تعمیرات بالخصوص مساجد کا لازمی حصہ رہا ہے۔ اسلامی دنیا کی مختلف مساجد کے میناروں کی بلندی مختلف ہوتی ہے اور بہت کم کوئی مسجد بغیر مینار کے ہوتی ہے۔ یہ مینار مؤذن کے اذان کہنے لئے کبھی مسجد کے اندر اور کبھی چاروں سمت میں بنائے جاتے ہیں۔ ابتدائی ایام میں مسجد کے ساتھ بلند ستون نہیں ہوا کرتے تھے۔

عالم اسلام کے پہلے مؤذن، بزرگ شخصیت سیدنا حضرت بلالؓ مسجد نبوی کے قریب سب سے اونچے مکان کی چھت پر چڑھ کر اذان دیا کرتے تھے۔ آپؐ نے فتح مکہ کے تاریخی دن سطح زمین پر خدا کے پہلے گھر خانۂ کعبہ کی چھت سے اذان کا نغمۂ سرمدی بلند کیا۔ اسلامی دنیا میں مساجد کے ساتھ باقاعدہ طور پر مینار سازی کی بنیاد بنوامیہ کے دور میں پڑی۔ بنی امیہ کے مشہور حکمران ولید بن عبدالملک کے دور میں اکثر مساجد پر مینار تعمیر کروائے گئے۔ پہلے پہل ہر مسجد میں ایک سے لے کر دو یا تین تک مینار تعمیر کئے جاتے رہے۔ بعد میں میناروں پر خوبصورت مینا کاری اور نقش و نگار کی وجہ سے مسجد کے حسن و دلکشی میں اضافہ کے لئے مسجد کے چاروں کونوں پر مینار سازی کی روایت پروان چڑھی۔ اسی طرح میناروں پر چڑھنے کے لئے مختلف قسم کے باہر یا اندر زینے بھی بنوائے جاتے تھے۔

مساجد کے ساتھ منسلک ہونے کی بناء پر مسلمانوں کے ہاں مینار کو مسلم طرز تعمیر کی حیثیت حاصل ہونے کے علاوہ ایک تقدس اور پاکیزگی بھی حاصل رہی۔ اب تو مینار مساجد کا حصہ گردانا جاتا ہے اور مساجد کے مینار اسلامی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ دینی شعائر کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔

اسلامی تاریخ میں مساجد کے میناروں کے علاوہ بہت سارے دیگر قدیم اور تاریخی میناروں کا ذکر ملتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں مغل تہذیب و تمدن اور طرز تعمیر میں مینار سازی کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں دہلی کا قطب مینار، شیخوپورہ کے قریب ہرن مینار اور جہانگیر کے مقبرے پر بنوایا گیا مینار قابل ذکر ہے، پاکستان بھر میں مشہور و معروف قرار دادِ پاکستان میں تعمیر شدہ ''مینار پاکستان'' ہر سچے پاکستانی کے دل کی دھڑکن اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

گو اسلامی دنیا میں میناروں کی تعمیر کا مساجد کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ لیکن ساری دنیا میں مختلف یادگاروں

کو زندہ و تابندہ رکھنے کے لئے مینار یا ٹاور بنائے جاتے رہے ہیں۔ عیسائیوں کے ہاں بھی گرجوں پر مینار بنائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایفل ٹاور، ٹوین ٹاورز تو ابھی کل کی بات ہے۔

اب مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آخر ان میناروں سے سوئٹزرلینڈ کے لوگوں کو کیا تکلیف پہنچتی ہے کہ ریفرنڈم کے ذریعے حکومت پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ سوئٹزرلینڈ میں مساجد پر مینار کی تعمیر ممنوع قرار دی جائے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ سیکولر مغرب کے منہ پر ایک ایسا طمانچہ ہے جو چھپائے نہیں چھپتا۔ اس کے علاوہ ان کے اس اقدام سے مذہبی تعصب اور تنگ نظری پھوٹ پھوٹ کر عیاں ہو رہی ہے۔ ہم ان سطور میں اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے مغرب کی تاریخ اور فکر و نظر کا گاہے گاہے ذکر کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ہمارے بعض اہلِ علم و قلم کو یہ خوش گمانی ہے کہ امریکہ اور مغرب کی حکومتوں کی پالیسیاں اسلام اور مسلمان مخالف ہو سکتی ہیں لیکن عوام کی اسلام کے بارے میں رائے ایسی معاندانہ نہیں ہوتی۔ میرا نقطۂ نظر اس تناظر میں یہ ہے کہ مغرب میں ساتویں صدی سے لے کر آج تک وہ فکر و رائے آگے بڑھ ہی نہ سکی جس میں مسلمانوں کے ساتھ بقائے باہمی کے لئے گنجائش موجود ہو۔ مغرب اور اسلام کے تعلقات و معاملات پر تو کتابوں کی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور یہ سلسلہ مزید بھی جاری رہے گا اور یہاں اس سلسلے میں کسی تفصیل کی گنجائش ممکن نہیں لیکن اتنا عرض ضرور کروں گا کہ مغرب میں یہ جو وقتاً فوقتاً اسلامی شعائر کے خلاف فتنے اٹھائے جاتے ہیں اس کا پس منظر مغرب اور اسلام کے درمیان کشمکش کی طویل تاریخ کا اثر ہر دور میں پایا جاتا ہے۔ اسلام کے حوالے سے اس مخالفانہ مخاصمانہ اور معاندانہ طرزِ عمل کے پیچھے یہ خدشات کارفرما ہوتے ہیں کہ کہیں اسلام کا منور چہرہ مغرب کے روحانی طور پر مایوس و محروم قوم کے لئے امید و آسرا بن کر سامنے نہ آئے۔ اعداد و شمار گواہ ہیں کہ 9/11 سے پہلے امریکہ اور مغرب میں غیر مسلم اسلام کی حق اور فطرت پر مبنی تعلیمات سے دھڑا دھڑ متاثر ہو کر اسلام قبول کر رہے تھے۔ اسلام سے لوگوں کو متنفر کرنے کے لئے اسلام کے خلاف اپنی طاقتور میڈیا اور بعض عاقبت نا اندیش مسلمانوں کے ذریعے پروپیگنڈے کا ایک طوفان کھڑا کر دیتے ہیں، کبھی حجاب و نقاب کو زیرِ بحث لا کر مسلمان خواتین کے خلاف قدامت پرستی اور دہشت گردوں سے مشابہت کا الزام عائد کیا جاتا ہے اور کبھی داڑھی اور پگڑی کو موردِ الزام ٹھہرانے کی کوشش ہوتی ہے۔

مغرب اپنے آپ کو بہت وسیع النظر اور مسلمانوں کو تنگ نظر اور جذباتی اور مذہبی جنونی مشہور کرنے میں دن رات لگا رہتا ہے لیکن جب ہم تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ بات الٹی نظر آتی ہے۔

قرطبہ کی جامع مسجد ہسپانیہ کے سقوط سے لے کر آج تک بند ہے۔ وہاں کسی مسلمان کو نماز پڑھنے کی اجازت نہیں۔ یہاں تک کہ علامہ اقبالؒ جب گول میز کانفرنس سے واپسی پر سپین آ رہے تھے تو قرطبہ کی جامع مسجد میں دو رکعت نفل پڑھنے کی اجازت کے لئے برطانوی سفارکاروں اور وزارتِ خارجہ کے ذریعے سفارش کروائی۔ تب کہیں جا کر قرطبہ مسجد کے صحن میں نفل پڑھنے کی اجازت ملی۔ علامہ اقبالؒ نے اسی سفر میں سرزمین قرطبہ پر ''مسجدِ قرطبہ'' کے عنوان سے اپنی مشہور وطویل نظم لکھی تھی جو بالِ جبرئیل کے صفحہ نمبر ۹۳ سے لے کر ۱۰۱ تک پھیلی ہوئی ہے۔ مسجد قرطبہ کے حوالے سے علامہ اقبالؒ کے یہ اشعار ہمیں آج ہمیں ایک دفعہ پھر یاد آ رہے ہیں۔

ہسپانیہ تُو خونِ مسلماں کا آمیں ہے
مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تیری خاک میں سجدوں کے نشان ہیں
خاموش اذانیں ہیں تیری بادِ سحر میں

اب کی بار اس ملک نے جس کے پُرامن ہونے کے بارے میں بہت کچھ کہا جاتا ہے اور وہاں بہت سارے بڑے بڑے مسلمان ارب پتیوں کے اکاؤنٹس ہیں، مسلمانوں کے شعائر میں ایک ایسی علامت کو ہدف تنقید بنا رہے ہیں جن کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ دراصل بات یہ ہے کہ مغربی دنیا بات بات پر مسلمانوں کے مختلف معاملات پر اقوامِ متحدہ اور اپنے ذرائع سے پابندیاں لگوانے کے عادی ہو گئے ہیں۔ مغرب کی طرف سے جب بھی اس قسم کی آوازیں اٹھتی ہیں تو ہماری طرف سے کوئی منظّم مبنی بر دلائل بہت کم آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ روز بروز حد سے نکلتے جا رہے ہیں۔ ہمارے ہاں سے بہت کم لوگوں نے کبھی کسی سنجیدہ اور با اثر فورم کے ذریعے مغرب سے پوچھا ہے کہ آخر آپ کے ہاں گرجوں کی ننز (Nuns) جو لباس پہنتی ہیں کیا اس کا قدامت پسندی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے علاوہ مغرب اور امریکہ میں ریاستی سطح پر سیکولرازم کے دعوی کے باوجود کیا حکومتی اہل کاروں اور حکومتوں کے معاملات پر چرچ کی تعلیمات کا اثر نہیں ہوتا۔ کیا عراق پر حملہ کرتے وقت بش نے کروسیڈ کا اعلان نہیں کیا تھا، کیا بش نے یہ نہیں کہا تھا کہ مجھے میرے خدا نے عراق پر حملہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ کیا بُش کا دو دفعہ صدر منتخب ہونے میں Evangelics (عیسائیوں) کے ووٹ کا عمل دخل نہیں تھا۔ اسی طرح بہت ساری باتیں تاریخ کا اور حال کا حصہ ہیں لیکن مسلمانوں کے ہاں ہزاروں برسوں سے اگر ایک روایت چلی آ رہی ہے تو آج مغرب کو ان سے بہت خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ اس لئے

مغرب میں مسجد میناروں کی تعمیر پر ریفرنڈم کرائے جا رہے ہیں۔

آج ہمیں شاید ان میناروں کی اہمیت اتنی زیادہ معلوم نہ ہو لیکن مغرب کو ان کا پس منظر اور موجودہ کردار بخوبی معلوم ہے، مغرب کا ایک آزاد اور غیر جانبدار یعنی غیر متعصب فرد مسجد کے میناروں کی خوبصورتی اور اس سے بلند ہوتی ہوئی اذان کے مقدس کلمات سنتا ہے تو مسلمانوں کے اس مسلسل، منظّم اور بے ریا عمل سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس طرح مغرب کا وہ طبقہ جو عیسائیت و یہودیت پر مذہب کی حیثیت سے بہت کم عمل پیرا ہوتا ہے اسلام کے قریب آنا شروع کر دیتا ہے۔ مغرب کی حکومتوں اور متعصب مذہبی لیڈروں اور پادریوں وغیرہ کو اس سے تکلیف پہنچتی ہے۔ اسلئے وہ اس قسم کے شوشے چھوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔

ایک زمانے میں ترکی کے موجودہ وزیر اعظم رجب طیب اردگان پر بھی قدامت پسندی اور رجعت پرستی کا الزام اس لئے لگایا گیا تھا کہ انہوں نے اپنی ایک نظم میں کہا تھا۔

''کہ یہ مساجد ہمارے قلعے ہیں۔ ان کے محراب ہمارے مورچے ہیں اور ان کے مینار ہمارے تیر و میزائل ہیں''۔ محترم وزیر اعظم کی اس بات میں ذرا برابر شک نہیں کہ کاش ہم اپنی مساجد ان کی محرابیں اور ان کے مینار واقعی اس حیثیت میں دیکھتے۔ کاش ہم مساجد کو وہی مقام دیتے جو جناب خاتم النبیینؐ نے بیان فرمایا ہے۔ آج ہماری مساجد کے منبر و محراب و مینار ایک دوسرے کے خلاف تعصب و تنگ نظری اور اپنے اپنے مسلک کی اشاعت کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ شاید اسی شامت اعمال کی وجہ سے اب یہ نوبت آئی ہے کہ مغرب ہماری مساجد کے میناروں پر پابندی لگوانے کے لئے ریفرنڈم کے ذریعے قانون سازی کا سوچ رہا ہے۔

مغرب کا یہ طرز عمل اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم مسلمان اپنے اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کرتے ہوئے قرآن و سنتِ رسولؐ کے صحیح اسپرٹ کے مطابق ایک مثال اسلامی فلاحی معاشرہ اور ریاست تشکیل دینے کے انتظامات کر لیں کہ اس طرح کہ آپس میں بھائی بھائی بن کر مضبوط ہو کر ابھریں گے اور ہمارے خلاف کوئی اس کا سوچ بھی نہیں سکے۔ جہاں تک میناروں پر پابندی کا تعلق ہے تو یہ ان شاء اللہ کبھی بھی ممکن نہیں ہوگا اور خود مغرب کے اندر سے اس کے خلاف آواز اٹھے گی۔ ہمیں چاہیئے کہ ان قوتوں کو مضبوط کریں جو ہماری تہذیب و تمدن کی حفاظت و سلامتی کی ضامن بن سکیں۔

☆......☆......☆

مستند تاریخ کی اہمیت

تاریخ کی مثال اقوام کیلئے حافظہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس قوم کی تاریخ گم ہو جائے یا کوئی قوم اپنی تاریخ بھول جائے تو اُس کی مثال اُس شخص کی سی ہو جاتی ہے جو اپنا حافظہ کھو گیا ہو اور جس کا حافظہ اور یادداشت کھو جائے اُس کو عرفِ عام میں پاگل کہا جاتا ہے۔

نبی ﷺ کی بعثت سے قبل تاریخ اور تاریخ نویسی کے بارے میں کوئی مستند معلومات موجود نہیں تھیں۔ مختلف اقوام کے پاس چند سینہ گزٹ روایات کو تاریخ کے نام پر دہرایا جاتا رہا۔ لیکن قرآن کریم کی صورت میں دُنیا کے سامنے بڑی اقوام کی تاریخ کے وہ گوشے سامنے لائے گئے جو انسانیت کے سامنے بطور عبرت پیش کئے گئے تاکہ بھولی بھٹکی انسانیت کیلئے قیامت تک اُن اقوام کی تاریخی مثالیں موجود رہیں اور انسانیت بھٹکنے اور گمراہ ہونے سے محفوظ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم نوحؑ ، عاد، ثمود، لوطؑ ، صالحؑ اور فرعون کی تاریخ کو کہیں ذرا تفصیل اور کہیں اجمالاً بیان کیا گیا۔

قرآن کریم نے لوگوں کو یہ بھی بتایا کہ تاریخ میں گزری ہوئی اِن اقوام کے قصّے تم لوگوں کو پہلے معلوم نہ تھے اور پیغمبر آخر الزمانؐ ، کے ذریعے بطور وحی تمہارے سامنے بیان کئے جا رہے ہیں۔ زمانہ گزرتا گیا اور مسلمانوں نے قرآن کریم کی اِن تعلیمات سے مستند تاریخ نویسی کے اصول سیکھ کر احادیث مبارکہ اور سیرت النبی ﷺ کی صورت میں دُنیا کے سامنے ایک ایسی مثال پیش کی جو نہ پہلے کہیں موجود تھی اور نہ بعد میں کسی قوم کے پاس پائی گئی۔ مشہور مستشرق ڈاکٹر ایس اسپرنگر نے مسلمانوں کی تاریخ میں محفوظ لاکھوں روایت کرنے (رواۃ) والوں کی سند کے ساتھ پوری تاریخ محفوظ ہونے کی مثال پر رشک کرتے ہوئے اِس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

مغربی مؤرخین جنہیں بعد میں مستشرقین کا نام ملا، مسلمانوں سے فن تاریخ نویسی اور تاریخ کی اہمیت جان کر اِس طرف متوجہ ہوئے اور اپنی چالاکیوں اور شاطر بازیوں کو شامل کر کے تاریخ کو حکومت اور سیاست کرنے کیلئے بُری طرح استعمال کیا۔ اِس فن اور مشن کو استشراق کے نام سے دُنیا بھر کی تاریخ کیلئے بالعموم اور مسلمانوں کی تاریخ کے لئے بالخصوص استعمال کیا۔ جبکہ مسلمان جہاں ایک طرف زوال کے شکار ہو کر دُنیا کی

حکمرانی سے معزول کئے گئے تو دوسری طرف دُنیا کے ضروری علوم کے حصول اور استعمال سے بھی محروم ہو گئے۔ تب مغرب کے اسکالروں کو موقع ملا اور اپنے ہاں کی سائنسی اور صنعتی انقلاب کے ذریعے جہاں دُنیا پر قابض ہوتے گئے وہاں مقبوضہ اور مفتوحہ اقوام کی تاریخ سے بھی کھیلنے لگ گئے۔

مغربی مؤرخین اور مستشرقین نے جہاں ایک طرف اپنی حکومتوں کے تعاون اور آشیرواد کے ساتھ ایک منظّم مہم کی صورت میں اسلام کے احکامات اور پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات پر بے جا اور بے بنیاد تنقید اور جارحانہ سوالات اُٹھائے وہاں اُن علاقوں کی تاریخ جہاں مسلمانوں کی حکومت رہی تھی، ایسے انداز میں لکھی کہ مسلمان دُنیا کے ظالم ترین اور غارت گری میں بے مثال حکمرانوں کی حیثیت سے سامنے آئے۔

اٹھارہویں اور اُنیسویں صدی میں جب تاریخ کو سماجیات (Social Science) کی وجہ سے نمایاں اہمیت حاصل ہوگئی اور مغربی اقوام اپنے ہاں کی سائنسی ترقی کی وجہ سے دُنیا پر قابض ہوتی چلی گئیں، تاریخ کو بھی ایک نیا رخ دیتی رہیں۔

اِن مغربی مؤرخین کی تاریخ نویسی نے دُنیا بھر کے مسلمانوں کی تاریخ کے مختلف گوشوں کو بری طرح متاثر کیا لیکن ظاہر ہے کہ ایک کالم میں سب کا احاطہ ناممکن ہے۔ لہٰذا آج کے کالم میں ھندوستان پر مسلمانوں کی حکومت اور اِس حوالے سے مغربی بالخصوص برطانوی مؤرخین کا سرسری ذکر کیا جائیگا۔

ھندوستان پر مسلمانوں نے سینکڑوں سال حکومت کی ہے اور اِس دور میں ھندوستان نے تعمیر و ترقی کی جو منازل طے کیں، اُس کے شواہد بر سرزمین آج بھی موجود ہیں اور کوئی بھی غیر جانبدار اور غیر متعصّب مسلم ھند میں مسلمانوں کے اِن کارناموں سے صرفِ نظر نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اعتدال پسند مؤرخین نے ھندوستانی تاریخ کے مسلم عہد کو ھندوستان کے عہد زریں سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تاریخ ھند کو جن لوگوں نے مرتب کیا اُن میں مسلمانوں کے خیر خواہ بہت کم تھے لہٰذا اُنھوں نے ھندوستان کی تاریخ کو ایسے انداز میں مدون کیا کہ اُس سے ایک طرف مسلمان ظالم، غاصب اور غارت گر ثابت کئے گئے اور دوسری طرف ھندوستان پر اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کیلئے ھندو اکثریت کو مسلمانوں کے خلاف اُکسا کر اپنے ساتھ ملاتے چلے گئے۔ جس نے آگے جا کر برطانیوں کے آخری برسوں میں ھندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان وہ صورت حال اختیار کی کہ اِن دو قوموں کا اکھٹے رہنا محال ہو گیا۔

ھندوستان کی تاریخ پر جن چار مغربی مؤرخین نے گہرے اثرات مرتب کئے اِن میں ممبئی کے گورنر الفنسٹن (Elphinstone)، جیمس مل (James Mill)، لین پول (Lanepoole) اور نہری ایلٹ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اِن مؤرخین میں جیمس مِل کی کتاب "ھسٹری آف برٹش انڈیا" وہ کتاب تاریخ ہے جس نے ھندوستان کی تاریخ کو ایک باقاعدہ منصوبہ کے تحت تقسیم کر کے ھندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سماجی اور معاشرتی اختلافات کو اِس انداز میں اُجاگر کیا گیا کہ مستقبل میں ھندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور اختلافات بڑھتے ہی چلے گئے۔

اِسی طرح ایک اور برطانوی مؤرخ ایچ۔ جی۔ کین (H.G.Keen) نے ھندوستان میں انگریزوں کی آمد کو ھندوستان کے ھندوؤں کیلئے ایک مسیحا اور نجات دہندہ کے طور پر پیش کیا۔ ھندوستانی تاریخ کے اِس نقطۂ نظر نے متعصّب ھندوؤں کو وہ بنیاد فراہم کی جس پر آگے چل کر ھندو مؤرخین نے ایسی تاریخ لکھی جس میں مبالغہ کی کوئی حد نہ رہی۔ انگریز مؤرخین نے مسلمانوں کی ھندوستان پر حکومت کو ظلم، جبر اور بربریت کی ایک ایسی مثال بنا کر پیش کی جس میں اورنگزیب کے ہاتھوں جو ھندوستان کا سب سے بڑا خدا ترس حکمران تھا، سکھوں کے گوروار جن سنگھ کے قاتل کے طور پر روشناس کرایا گیا۔ جس کے نتیجے میں ھندو تو ھندو مسلمانوں کا سکھوں کے دُشمن کے طور پر اُبھارا گیا۔ انگریزوں کے اِس "احسان" کا بدلہ سکھوں نے قیامِ پاکستان کے وقت مسلمانانِ ھند سے ظلم و بربریت کی حد کر کے اُتار دیا۔

الفنسٹن (Elphinston) گورنر ممبئی نے ھندوستان کی تاریخ ایسے انداز میں مرتب کی کہ ھندوستان میں مسلمانوں کے زوال اور انگریزوں کی آمد اور اُن کی حکومت کو رحمتِ خداوندی سے کم نہیں گردانا جا سکتا۔ جس سے ھندوستان کے وہ ھندو جو کبھی مسلم ھند کے مداح تھے جس کی بناء پر ھندو مسلم تعلقات کی سطح اتنی کشیدہ کبھی نہیں تھی جتنی اِن کتب کی اشاعت اور معاشرے کے اہم افراد کے ہاتھوں میں پہنچنے کے بعد ہوئی۔

اگرچہ ھندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی، ثقافتی اور تہذیبی حوالوں سے اختلافات تھے اور ہیں لیکن اِن کے درمیان مشترکات (Commonalties) بھی موجود تھے اور اِسکے علاوہ مسلمان حکمرانوں کے عدل و انصاف سے بھی ھندو عوام مطمئن تھی، لیکن اِن برطانوی مورخین کی متعصّبانہ اور بے بنیاد تحریروں

میں مسلمان حکمرانوں بالخصوص محمود غزنوی، شہاب الدین غوری اور اورنگزیب کو ایسے ظالم، غارت گر اور سفاک حکمرانوں کی شکل میں پیش کیا گیا کہ وہ ھندوؤں کو واقعی خوں خوار نظر آئے۔ پھر ھندو مؤرخین نے بھی اِن کتب کو مستند حوالہ سمجھ کر ھندوستان کی وہ تاریخ مدون کی جس میں محمود غزنوی کو ایک "ڈاکو اور لٹیرا" ہونے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ کہا گیا۔ جس کے ذریعے ھندوؤں کی آئندہ نسلوں میں وہ زہر گھولا گیا کہ برطانوی راج کے زوال کے آثار دیکھ کر جہاں ھندوؤں سوراج کا نعرہ بُلند کیا تو ھندوستان کے مسلمانوں نے اپنے حقوق کے تحفظ کیلئے مسلم اکثریتی علاقوں میں صوبائی آزادی اور مسلم حکمرانی کا نعرۂ لگایا، جس کو برطانوی مؤرخین کے زیر اثر ھندوؤں کے متاثر شدہ ذہن نے قبول نہ کیا اور مسلمانانِ ھند پر حکومت کے خواب دیکھ کر اور ہزار سالہ انتقام کی منصوبہ بندی کی۔ الحمدللہ! کہ ھندوستان کے ھندو اِس میں تو کامیاب نہ ہو سکے لیکن مسلم ھند کے حکمرانوں کے بارے میں برطانوی مؤرخین کی تحریروں میں ھندو مؤرخین وہی نظریہ اپنی نئی نسلوں تک منتقل کرتے رہے جس میں مسلمان حکمرانوں کو سرزمین ھند کے تاخت و تاراج اور پامال کرنے والے لکھا گیا ہے۔ اِس سے مسلمانوں اور ھندؤوں کے جذبات میں ایسا اشتعال پیدا ہوا کہ اُن کے درمیان کسی بات پر اتفاق محال نظر آنے لگا۔

آج ھندوستان کے حکمرانوں کی طرف سے جو سلوک اور رویہ پاکستان اور پاکستانیوں کے ساتھ روا رکھا جا رہا ہے یہ اُس تاریخ کا شاخسانہ ہے۔ لہٰذا ضرورت اِس بات کی ہے کہ ھندوستان کی تاریخ کو ھندوستان کے اُن لوگوں کے ساتھ جو غیر متعصب ہیں، از سرِ نو زیرِ بحث لا کر اُن ابواب اور فصول کو معتدل کیا جائے جس کی وجہ سے یہ صورت حال برپا ہے ورنہ کم از کم ہم اپنی نوجوان نسلوں کو ڈاکٹر تارا چند کی لکھی ہوئی تاریخ کم از کم نہ پڑھائیں۔

☆......☆......☆

پاکستان کا قیام ناگزیر تھا

پاکستان میں گاہے گاہے یہ عجیب وغریب ونامانوس آواز تک اٹھتی رہتی ہے کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو برصغیر پاک وہند کے مسلمان بہت فائدے میں ہوتے۔ پچھلے دنوں تو پاکستان کے ایک بڑے روزنامے کے بہت بڑے کالم نگار نے یہاں تک لکھا کہ اگر (خاکم بدہن) برصغیر کے مسلمان پاکستان نہ بناتے تو شاید کے آج کی دہشت گردی اور ایٹمی پاکستان کی وجہ سے مسلمانانِ برصغیر پاک وہند اتنے مخدوش وہلاکت خیز حالات سے دوچار نہ ہوتے۔ اگرچہ پاکستان کے ایک دوسرے بڑے روزنامے کے کالم نگاروں نے اس تصور کا بروقت مدلل اور مسکت جوابات دیئے لیکن عرض یہ ہے کہ پاکستان کو قائم ہوئے باسٹھ برس گزرنے کے بعد وقتاً فوقتاً اس قسم کی ناپسندیدہ آوازیں ختم نہ ہوسکیں۔ اس کے اسباب پر تو ذرا آگے جا کر بات کریں گے لیکن پہلے میں یہ عرض کرتا چلوں کہ قیامِ پاکستان ناگزیر تھا اور اس کا بننا نہ صرف اس وقت اور آج کے مسلمانوں کے لئے مفید ترین اور ہر لحاظ سے اسلامی تعلیمات کا تقاضا تھا بلکہ قیامِ پاکستان برصغیر میں آئندہ کی مسلمان نسلوں کے لئے بھی امیدوں اور تمناؤں کا مرکز ومحور اور تحفظ وسلامتی کا گہوارہ ہے، میں تو یہ بات بھی ببانگ دہل کہتا ہوں کہ قیامِ پاکستان کے ذریعے کروڑوں مسلمانوں کی بیک وقت برطانوی اور ہندو سامراج ورام راج سے آزادی اتنی بڑی نعمت ہے کہ بیسوی صدی کے ستر کے عشرے تک پاکستان کے دیکھا دیکھی سارے اسلامی ممالک استعمار کے خونین پنجوں سے آزاد ہوچکے تھے۔ یہ پاکستان کے قیام کی برکت تھی کہ دنیا کی اس سب سے بڑی اسلامی مملکت کی وجہ سے مسلمانانِ عالم کے دلوں میں آزادی کی ایسی امنگ پیدا ہوئی کہ استعماری قوتوں نے وہاں سے بھاگ جانے میں ہی عافیت سمجھی۔

ہمارے ہاں بعض ناعاقبت اندیش اب بھی متحدہ ہندوستان کے گن گانے سے باز نہیں آتے اور غیروں کی زبان میں قیام بنگلہ دیش کو نظریۂ پاکستان یا دوقومی نظریے کی نفی کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا ہوگا کہ قیام بنگلہ دیش کا تعلق ہماری نالائقیوں، سیاہ بختیوں، بے انتظامیوں، تعصّبات اور کچھ غیروں کی سازشوں کا نتیجہ تو ضرور تھا، لیکن دوقومی نظریے کی نفی قطعاً نہیں تھی۔ اگرچہ کہنے کو اندرا گاندھی نے دہلی کے لال قلعے سے خطاب کرتے ہوئے دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کے سامنے کہا کہ "ہم نے دوقومی نظریے کو خلیج بنگال میں

غرق کردیا ہے‘‘ لیکن یہ تب ہوتا اگر خدانخواستہ بنگلہ دیش بہ رضاورغبت قائم ہوکر ہندوستان کا حصہ بنتا، الحمدللہ! بنگلہ دیش آج بھی مسلمان ملک کی حیثیت سے قائم ہے اور مسلم امت کا ایک حصہ ہے اور پاکستان و بنگلہ دیش کے مسلمانوں کے درمیان محبت واخوت کا رشتہ قائم ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ پاکستان اور بنگلہ دیش کے دانشوروں، اساتذہ، صحافیوں، اہل علم ودانش اور عوام کی اکثریت نے یہ احساس کیا ہے کہ دونوں طرف سے غلطیاں ہوئی ہیں اور ان غلطیوں اور کوتاہیوں کو راج راج اور سامراج نے مل کر اس طرح استعمال کیا کہ دونوں طرف کے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑا، لیکن آج اس زیاں کا احساس اور دونوں طرف تعاون وملاپ کی خواہش کا ابھرنا اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ دوقومی نظریہ کوئی باجرے کا سٹہ نہیں ہے کہ کوئی اٹھا کر ہاتھوں میں مسل کر فنا کے گھاٹ اتار دے گا۔

پاکستان کے قیام سے مسلمانان برصغیر کو جو بیش قیمت فوائد نصیب ہوئے وہ زندگی کے ہر میدان میں ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔ پچھلے دنوں پاکستان کے ایک بڑے فوجی افسر کا یہ انٹرویو پڑھ رہا تھا، انہوں نے قیام پاکستان کے برکات کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر پاکستان قائم نہ ہوتا تو میں آج ایک فوجی افسر ہونے کی بجائے کسی ہندو فوجی افسر کا بیٹ مین (اردلی) ہوتا۔ اس طرح میں نے کئی بڑی محبّ وطن اور شکرگزار صنعت کاروں کے انٹرویوز میں یہ بات پڑھی ہے کہ ہم جو کچھ ہیں پاکستان کی وجہ سے ہیں ورنہ متحدہ ہندوستان میں ہم کسی ہندو ساہوکار وصنعتکار کے منشی تو ہوسکتے تھے صنعت کار کبھی نہ ہوتے۔

متحدہ ہندوستان میں انگریز کی متعصّبانہ پالیسیوں کا اندازہ تو اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ساری بڑی بھاری صنعتیں اور کارخانے اور تعلیمی ادارے اور دیگر ترقیاتی کام ہندوستان کے ان علاقوں جیسے کلکتہ، بمبئی وغیرہ میں کروالئے جو ہندو اکثریتی علاقے تھے جبکہ مسلم اکثریتی علاقوں پنجاب اور سندھ کو اجاڑ وویران ہی رکھ چھوڑا۔ سرحد اور بلوچستان کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ بعض لوگ کہہ سکتے ہیں کہ وہاں انگریز مخالف رجحان کے پیش نظر ایسا نہ ہوسکا۔ حالانکہ یہ ایک خاص منصوبہ بندی اور تعصب کے تحت تھا اور انگریز اور ہندو نے مل کر مسلمانانِ ہند کو پسماندہ رکھنے کے انتظامات کئے۔ تاکہ مسلمانانِ ہند اپنے اکثریتی علاقوں کے کمزور انفراسٹرکچر کو دیکھتے ہوئے کبھی الگ وطن کے بارے میں سوچ بھی نہ سکیں۔

حالانکہ ۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ کے تحت قائداعظم نے یہ کوشش کی تھی کہ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کو

اپنے حقوق کی آئینی ضمانت کے ساتھ ایک باوقار زندگی گزارنے کے مواقع فراہم ہوں تو جہاں ہم سینکڑوں سال رہے ہیں اب بھی رہا جا سکتا ہے لیکن ہندو کے تعصب اور مسلمان سے ہزار سالہ غلامی کا بدلہ اُتارنے پر تلے ہوئے تھے۔ اگرچہ مسلمانوں نے ہندوؤں کو ہندوستان میں غلام کی حیثیت سے کبھی نہیں دیکھا تھا بلکہ اپنی رعایا کی نظر سے دیکھا تھا۔ عظیم مغلیہ سلطنت میں ہندو راجاؤں کی راجدھانیاں اور مغل سلطنت میں بڑے بڑے مناصب پر ہندوؤں کا فائز ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمانوں نے جہاں بھی حکومت کی ہے وہاں اپنے عوام و رعایا کو بلا امتیاز رنگ و نسل و مذہب کے اُن کو عدل و انصاف فراہم کیا ہے۔

ہندوؤں کے اسی تعصب نے قائداعظم اور مسلمانانِ ہند کو اس بات پر مجبور کیا کہ مسلمانوں کا ایک الگ وطن ناگریز ہے کیونکہ اب معاملہ مسلمانوں کے ملی اور دینی تشخص کے بقاء تک پہنچ گیا تھا۔

گذشتہ باسٹھ برسوں میں ہندوستان کی حکومتوں کا جو رویہ پاکستان اور پاکستانیوں کے ساتھ رہا ہے اور آج بھی جاری ہے اُس کے پیشِ نظر کون کافر کہے گا کہ قیامِ پاکستان ناگزیر نہیں تھا ۱۹۴۸ء، ۱۹۶۵ء، ۱۹۷۱ء کی جنگیں اور آج افغانستان میں بھارتی قونصلیٹوں میں قائم ''را'' کے ذریعے پاکستان میں دہشت گردی کی آگ کو جس طرح تیز کرنے کی کوشش ہو رہی ہیں اور پاک افواج کو جن عظیم قربانیوں پر آمادہ کیا گیا ہے۔ کیا اِس بات کے ثبوت کے لئے کافی نہیں کہ سامراج اور رام راج کبھی پاکستان کے دوست نہیں ہو سکتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پچھلے دنوں بھارتیہ جنتا پارٹی کے بہت معتبر لیڈر نے ''جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے'' کے مصداق اپنی کتاب میں قائداعظم، ہندوستان کی تقسیم اور سیاست وغیرہ میں اس بات کا بہت مضبوط اعتراف کیا ہے کہ پنڈت نہرو کی طرزِ عمل و فکر نے قائداعظم اور ہندوستان کے ہندوؤں کے تعصب نے مل کر قائداعظم اور مسلمانانِ ہند کو الگ بنانے پر مجبور کیا۔

آج اگرچہ پاکستان وقتی طور پر ہمارے بعض کوتاہیوں اور چند دوست نما اغیار کی وجہ سے مشکلات سے دوچار ہے لیکن اِس کے باوجود پاکستان میں ہمیں جو آزادی حاصل ہے اور زندگی کے مختلف میدانوں میں جو امکانات کھلے ہاتھوں منتظر ہیں اُس کے مقابلے میں ہندوستان کے مسلمانوں کا تصور کرتے ہوئے رونگٹھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سارے غیر جانبدار مبصرین، صحافی دانشور اور مؤرخین اِس بات پر متفق ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے مقابلے میں پاکستان کے مسلمان بدرجہا آسودہ حال اور تہذیب و ثقافت اور

مذہبی وفکری آزادی سے مالا مال ہیں۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کے سینئر لیڈر جسونت سنگھ نے اپنی کتاب میں اس بات کا برملا اظہار کیا ہے کہ مسلمانانِ ہند کو ہندوستان میں کبھی ہندوستان کا شہری سمجھا ہی نہیں گیا۔ اگر اتنی تابعداری، فرمانبرداری عاجزی اور ہندوستان کی تہذیب وثقافت میں ضم ہونے کے بعد بھی ہندوستان کے ہندو بھارت کے کروڑوں مسلمان کو باسٹھ برس بعد بھی آئینی تحفظ سیکولرازم کے دعوؤں کے باوجود جینے کا حق نہیں دے سکے تو متحدہ ہندوستان میں اس کی کیا ضمانت تھی۔

کیا یہ مقام شکر نہیں ہے کہ کم ازکم پاکستان کے سترہ کروڑ اور بنگلہ دیش کے ساڑھے پندرہ کروڑ مسلمان اوران کی آئندہ نسلیں رام راج کی غلامی سے محفوظ ہیں۔

اگر امت مسلمہ اور پاکستان و بنگلہ دیش مضبوط ملک بن جائیں اور امت مسلمہ او آئی سی کے ذریعے ایک باوقار کردار ادا کرتی تو شاید ہندوستان کے مسلمان اس حال میں نہ ہوتے کہ آج وہاں ہندو اکثریتی علاقوں میں مسلمانوں کو خالص ہندو مذہبی تہواروں میں اپنی سلامتی وتحفظ کے ڈر سے شریک ہونا پڑتا ہے۔

یہ چند سطور لکھنے کا سبب یہ خبر تھی کہ پچھلے دنوں ایک ہندو تہوار کے موقع پر ایک باپردہ مسلمان خاتون نے اپنے چھوٹے بیٹے کو کرشن کا لباس پہنا کر اُس کے ہاتھ مرلی تھما کر ہندوستان کے متعصب ہندوؤں کو دکھایا کہ دیکھو اب تو ہمیں تحفظ دو کہ ہم نے آخر تمہاری تہذیب وثقافت بھی اپنے چھوٹے بچوں کو منتقل کر ہی دی۔ کیا اب بھی ہمیں پاکستان کی نعمت کی شکر گزاری میں اللہ کے حضور سجدہ ریز نہیں ہونا چاہیئے؟

☆......☆......☆

تاریخ کی گواہی

تاریخ میں اس بات کے شاید بیسیوں واقعات ہیں کہ کوئی قوم گرداب میں پھنس گئی اور اس قوم میں سے ایک باکردار فرد نے رہنمائے قوم کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے اپنی ٹیم کے ساتھ دن رات سخت محنت کر کے قوم کی نیّا کو پار لگایا۔ باکردار رہنما نہ صرف اپنے ملک وقوم کو درپیش مصیبت سے نکالتا ہے بلکہ وہ اپنے کردار کے نمونہ سے پوری قوم میں سچائی، وفاداری اور دیگر صفات عالیہ کا افسوں پھونک دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں ایک باوقار قوم تشکیل پاتی ہے۔ باوقار رہنمائے قوم اور باکردار قوم کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے قول وقرار کو نبھاتے اور اپنے کیئے ہوئے عہد کا ہر حال میں پاس رکھتے ہیں۔

انسانیت کی پوری تاریخ میں آپ کو اس لحاظ سے صرف ایک مثال ایسی لازوال ہستی ملے گی جو نہ صرف خود اخلاق عالیہ وفاضلہ کے اعلیٰ ترین معیار پر فائز تھی۔ بلکہ اپنے ایسے بے مثال کردار واخلاق کے نمونے کے ذریعے اپنی اس قوم کو جو ذلت وادبار اور پستی کی اتاہ گہرائیوں میں گری تھی کو بابرکت رفعتوں سے ہمکنار کیا۔

کسی بھی راہنمائے قوم کے لئے تو لازمی ولابدی اصول جو آپؐ نے نبوت اور بعثت سے پہلے ہی اپنے اخلاق کی بنیاد بنائی تھی، صادق اور امین کے ہیں۔ اللہ کے سارے انبیاء سچے اور امین ہوتے ہیں لیکن آپؐ اس حیثیت میں بھی سب سے ممتاز ونمایاں ہیں۔ آپؐ نے انہی دو صفات کے ذریعے نبوت اور حکمرانی فرمائی۔ آپؐ کی انہی دو صفات نے زندگی کے سارے شعبوں کو جگمگایا۔ عربوں کی اس قوم کو جو تمام برائیوں کی آماجگاہ بن چکی تھی، کو حکمرانی کے یہی زریں اصول عطا فرمائے اور یوں انہوں نے دنیا میں اخلاقیات کا نظام رائج کیا۔

آج پوری امتِ مسلمہ بالعموم اور پاکستان بالخصوص اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیئے گئے اس وعدے کو بھول چکی ہے جو کبھی ہماری رفعت، حفاظت اور عزت وآبرو کا ضامن تھا۔ اس وعدے کو بھولنے کے نتیجے میں ادبار ومصائب نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ یہ جانتے اور دیکھتے ہوئے کہ ہم بہت بڑی گہرائی میں گر پڑے ہیں، پھر بھی ڈھٹائی کے ساتھ وہی کچھ کر رہے ہیں جو ہماری پستی اور زوال کا سبب ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہم خلوص دل کے ساتھ اصلاح احوال کی کوشش بھی نہیں کر رہے۔ جبکہ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ شر پسندوں کو پسند نہیں کرتا۔ فرمانِ الٰہی ہے ''اللہ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم نے اس سے کوئی عہد باندھا ہو اور اپنی قسمیں پکی کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو''۔

کیا گذشتہ ساٹھ برسوں سے ہماری حالت اس عورت کی سی نہیں ہوگئی جس کا ذکر قرآن کریم نے یوں کیا ہے ''تمہاری حالت اس عورت کی سی نہ ہو جس نے آپ ہی محنت سے سوت کا تا اور پھر آپ ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا''۔

ہم نے پاکستان کس محنت سے بنایا تھا، لیکن کیا اپنی حماقتوں کے باعث مکہ کی اس احمق بڑھیا کی طرح جو دن بھر سوت کاتتی اور شام کو خود ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی، خود ہی دو ٹکڑے کر کے ان حالات تک نہیں پہنچایا۔ اسلام افراد اور اقوام کو ایک اعلیٰ نصب العین کے تحت زندگی گزارنے کا درس دیتا ہے۔ اسلام کو بطور عقیدہ تسلیم کرنے کے بعد اگر انسانوں کے انفرادی و اجتماعی معاملات اس کے زریں اصولوں کے مطابق استوار نہ کئے جائیں، تو زندگی ایک کھیل اور مذاق بن کر رہ جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں دنیا سے عدل و اصاف اور امن و امان رخصت ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً پھر شر و فساد اور بگاڑ کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ آج دنیا میں جو شر و فساد کی قوتوں کی ہر طرف حکمرانی ہے وہ اسی لئے ہے کہ قوم نے اپنے رب ذوالجلال سے کئے ہوئے عہد کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اقوام نے آپس کے معاہدات کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔

قیام پاکستان کا مقصد وحید اگر چہ وقتاً فوقتاً بعض دانشوروں نے کچھ اور بھی بیان کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس بات کو آج بھی کوئی دلائل کے ساتھ کبھی نہیں جھٹلا سکتا کہ قرارداد پاکستان اور قراردادِ مقاصد اس پر گواہ ہیں کہ نئی مملکت میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی حکمرانی ہوگی۔ لیکن ہماری شومئی قسمت دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے لاکھوں شہیدوں اور اسلاف کی قربانیوں کے طفیل حاصل کردہ آزاد ملک پاکستان میں آزادی کے بعد پوری قوم کی قوم حصول زر اور دولت کے انبار لگانے میں ایسی منہمک ہوئی کہ ہم جائز و ناجائز اور حرام و حلال کی تمیز بھی یا تو بھول گئے یا عمداً قصداً بالائے طاق رکھدی۔

حالانکہ چاہئے تو یہ تھا کہ حصول آزادی کے بعد قیام پاکستان کے مقاصد اور اللہ سے اپنے کئے ہوئے عہد کے پیش نظر کرۂ ارض پر ابھرنے والی اس نوزائیدہ سلطنت کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے دن رات جت جائیں، لیکن اس کے بالکل برعکس ہم نے بہت جلد ہوسِ اقتدار میں آدھا ملک ہندوؤں کے ہاتھوں گنوادیا۔

اپنے آغاز کے اول دن سے پاکستان اسلام دشمن عناصر اور ممالک کی ظالمانہ سازشوں کی آماجگاہ بن گیا اور دوسری طرف اقتدار کی رسہ کشی کی اندرونی سازشوں نے اس کے ہر مؤثر ادارے کو اتنا کمزور اور بعض کو تباہ کر دیا کہ ان کا کوئی اعتبار ہی نہ رہا۔ وطن عزیز کے حصے بخرے ہونے سے بچانے کی بجائے ہم بیرونی آقاؤں

کے اشاروں پر کٹھ پتلیوں کی طرح ناچتے رہے اور اپنے ملک کو خود ناہموار راستوں پر ڈالتے گئے۔اس جرم میں عوام اور خواص [حکمران] دونوں برابر کے شریک ہیں۔

خود رہبرانِ قوم ہیں آلائشوں میں گم
ہم سے مطالبہ مگر قربانیوں کا ہے

اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا کیا ہوا وعدہ "الست بربکم قالوا بلیٰ" کو بھول کر ہم قیام پاکستان کے مقاصد کی تکمیل سے بھی بھٹک گئے۔اسی کے نتیجے میں مسلمان قوم کے اہم فرض منصبی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اعلیٰ مقام کو بھی کھو بیٹھے۔ظاہر ہے کہ جب یہ اعلیٰ مقاصد ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے تو پیچھے تو کفار، بت پرستوں، اور طاغوتی طاقتوں کے تراشیدہ مصنوعی خدا از قسم دولت اور دنیا کا اقتدار وغیرہ رہ جاتے ہیں،سو ہم بھی ان کو دوسری غیر مسلم اقوام کی طرح ان کی پوجا میں لگے ہوئے ہیں۔جس کا نتیجہ اس وقت بدترین دہشت گردی کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔دہشت گردی کی جڑ کو کاٹنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے احکامات سے روگردانی نہ کریں۔سماجی عدل وانصاف کو معاشرے میں رائج کریں۔

ہمیں بحیثیت قوم آج اس بات پر تہہ دل اور خلوص دل کے ساتھ سوچنا ہو گا کہ قوموں کے عروج وزوال کی داستان سے سبق کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ہم میں کم از کم اتنی عقل وخرد تو ہونی چاہئے کہ ہم ان گزری ہوئی اقوام کے احوال سے جو اللہ کے غضب کا نشانہ بنیں، درس عبرت حاصل کریں اور اپنا قبلہ درست کر کے صحیح سمت کا تعین کریں۔قبل اس کے کہ کوئی فرنگی کی طرح کی ظالم قوم پھر ہماری آزادی سلب کرے یا سونامی جیسا کوئی بے رحم طوفان یعنی عذاب ہمارا نام ونشان مٹا دے۔

دین سے لاپرواہی اور غفلت، سماجی اور معاشی پس ماندگی اور ناخواندگی اور جہالت نے مل کر ہماری نئی نسل کو فرقہ واریت، انتہا پسندی جیسی لعنت میں مبتلا کر دیا ہے جو انہیں تخریب کاری پر ابھارتی ہے جو بالآخر دہشت گردی جیسی لعنت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔لہٰذا اب وقت ہے کہ ہم اپنے پیارے دیس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے کئے ہوئے وعدے کا پاس کرتے ہوئے غلغلہ بلند کریں اور معاشرے میں ہر قسم کے ظلم وزیادتی کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے کمربستہ ہو جائیں ورنہ

ایسی بستی کو زمین چاٹ لیا کرتی ہے
ظلم بڑھ جائے جہاں حد سے زیاد برلاس